اوراقِ گم گشتہ

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان



اوراقِ گم گشتہ

۱۹۹۷ء

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان

غلام مصطفےٰ اکادمی - پاکستان

کراچی حیدرآباد

نام کتاب	اوراقِ گم گشتہ
مصنف	ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان
تعداد	۳۰۰
اشاعت اول	دسمبر [illegible]
ناشر	سرفراز احمد خاں

ملنے کا پتہ

- غلام مصطفےٰ اکادمی، المصطفےٰ مسجد، پرانی یونی ورسٹی
  حیدر آباد۔ سندھ
- 20-D بلاک 10 A گلشن اقبال کراچی
- L-791 سیکٹر 11-E یوپی سوسائٹی نارتھ کراچی
- المصطفےٰ ایجوکیشنل سوسائٹی قصبہ کالونی کراچی

مجاہد ملت 'چہرۂ گلاب' **حضرت گلاب خان علیہ الرحمہ**

(والد بزرگوار حضرت مولانا ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان صاحب دامت برکاتہ

کے نام

جن کی تربیت نے میرے شیخ مدظلہ کو

وحید العصر بنا دیا

اور

عاجز کو ایسی سعادت نصیب ہوئی

یکے از عشاق شیخی و مرشدی

احقر الزماں ——— سرفراز احمد خان

گورش بود ز نور پُر روحش صغار مصطفےٰ | یاد گلاب خان را سایہ لطیف کبریا

۶ ۱ ۹ ۲ ۴   ۵ ۱ ۳ ۴ ۴

پھر یہ اشعار لکھے :-   ع گلاب خاں بہ گلستانِ خلد آباد ہے

پدر حیات بہ اسہال سحر و دام بکرد | ز فوتِ خویش شکستِ دلِ غلام بکرد

بوقت صبح بہ سہ شنبہ ہشت دہ ذی الحج | بہ بیست و سہ ز جولائی قضا تمام بکرد

چو ہشت دارِ جہاں را ز حکمِ حیِّ ودود | گلاب خاں بہشتِ جنان مقام بکرد

۶ ۱۹ ۲ ۴   ۹ ۱ ۳ ۴۲

فہرست مضامین

مقدمہ

از

اشرف المشائخ، قدوۃ المحققین، وحید العصر

حضرت مولانا پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان صاحب مدظلہ العالی

قراءت سبعہ، فاضل علوم اسلامیہ، فاضل عربی، فاضل ہندی/ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

میرے عزیز قلبی سرفراز صاحب بڑی کوشش اور کاوش سے میرے بھولے ہوئے مضامین یکجا کر رہے ہیں۔ کمزوری کی وجہ سے میں اب اس قابل نہیں ہوں کہ نظر ثانی کرسکوں یا ان کی اغلاط کو درست کرسکوں۔ دوسرے پیارے عزیز وکیل احمد خاں ان مضامین کی تصحیح کر رہے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ تصحیح درست ہو[1]۔

میں ان دونوں عزیزوں کے لئے انتہائی خلوص کے ساتھ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو سرفراز و سربلند فرمائے۔ آمین ثم آمین

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

احقر۔ غلام مصطفےٰ خان

---

[1] اس کتاب کی اشاعت کے بعد مجھ حقیر سے حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہ نے فرمایا (مفہوم) کتاب ہر لحاظ سے عمدہ اور اغلاط سے پاک ہے۔

احقر الزماں۔ سرفراز

عرض جامع مضامین

مخدومی و مرشدی و مخدومی وحید العصر قبلہ حضرت مولانا ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان صاحب دامت برکاتہ نے زمانہ طالب علمی سے بہت لکھا اور الحمد للہ اب تک لکھ رہے ہیں۔ متعدد کتابیں اور بکثرت مضامین خود انھوں نے شائع کیے ہیں۔ تاہم بہت سے مضامین (اور تنقیدیں) اب نایاب ہیں۔ ریڈیو سے نشر ہونے والے بعض مضامین دستیاب ہوئے ہیں اور بعض رسالوں سے شائع ہونے والے مختصر مضامین بھی حاصل ہو سکے ہیں۔ ان سب کو یہاں یکجا شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت صاحب مدظلہ کے صدقے میں مجھ عاجز سے اتنا بڑا کام لے لیا جس کا میں کسی طرح بھی اہل نہیں تھا۔ خدا کرے کہ میری سعی مشکور ہو۔ آمین

مضامین کے حصول کے سلسلے میں مختلف لائبریریوں سے بھی استفادہ کیا۔ اس سلسلے میں لیاقت نیشنل لائبریری' غالب لائبریری' بیدل لائبریری اور آل پاکستان ایجوکیشنل ریسرچ سینٹر کراچی' کے عملے نے بہت زیادہ تعاون کیا۔

ہمارے حضرت مولانا حافظ ڈاکٹر منیر احمد خان صاحب مدظلہ نے ہر معاملے میں بڑی مدد فرمائی۔ رسالہ آہنگ (ریڈیو پاکستان) کے تمام مضامین محترمی سہیل مفتی صاحب نے مہیا فرمائے' محترمی محبوب احمد خان صاحب اور محترمی عبید احمد خان صاحب کا بھی بڑا تعاون حاصل رہا۔

محترمی محمد وکیل احمد صاحب اور محترمی عبدالوحید صاحب نے بڑی محنت سے کتاب کی از سر نو کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ فرمائی۔ بھی سید عثمان صاحب کو

میں کس طرح بھول سکتا ہوں جنھوں نے کتاب کی اشاعت میں بھرپور تعاون کیا۔

اللہ تعالیٰ سے دلی دعا ہے کہ مرشدی قبلہ حضرت صاحب مدظلہ کے صدقے میں ان تمام حضرات کو اجر عظیم اور فلاح دارین نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

کتابت کی تصحیح میں حتی المقدور کوشش کی گئی ہے تاہم قارئین اگر کوئی غلطی دیکھیں تو ادارے کو مطلع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

احقر الزماں۔ سرفراز احمد خان

"فرمایا حضرت صاحب مدظلہ نے"

فنا فی الشیخ کے معنی شیخ کے توسط سے حضور انور ﷺ کی غلامی کو پوری طرح (حتی الامکان) ہر وقت اختیار کرنا۔

رفیق رسولؐ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

(آہنگ ۔ ریڈیو پاکستان ۔ مارچ ۱۹۸۴ء)

آپ کا اسم گرامی عبداللہ اور لقب صدیق اور عتیق ہے ۔ اور یہ دونوں لقب حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم نے عنایت فرمائے تھے ۔ آپ کی کنیت ابوبکر ہے اور آپ کا نسب آٹھویں پشت میں حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے دو سال اور قریب تین ماہ بعد آپ پیدا ہوئے ۔ اسلام سے پہلے آپ قریش کے اشراف میں بڑی عزت و ثروت رکھتے تھے ۔ دیت اور تاوان کے فیصلے آپ ہی کے ذمے تھے ' جب آپ کسی کی ضمانت کرلیتے تو وہ قابل اعتبار سمجھی جاتی ۔ علم انساب میں بڑی مہارت رکھتے تھے ' فن شعر میں بھی کمال حاصل تھا' لیکن اسلام لانے کے بعد آپ نے شعروشاعری چھوڑدی تھی' بچپن ہی سے آپ کو حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی محبت تھی ' حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) جب صغرسنی میں اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ ملک شام جانے لگے تو آپؓ نے حضرت بلالؓ کو کرایہ پر لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لیے ساتھ کردیا تھا اور راستے کے لیے توشہ بھی ساتھ کردیا تھا۔

حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہوتے ہی آپ مردوں میں سب سے پہلے اسلام لائے اور آپؓ کی وجہ سے دوسروں کے دلوں میں بھی اسلام کی رغبت پیدا ہوئی۔ آپ نے اسلام لاتے ہی مال تجارت کے علاوہ چالیس ہزار دینار اسلام کی اشاعت کے لیے پیش کیے ۔ اور سات غلاموں کو خرید کر آزاد کردیا' جن کو اسلام لانے کی وجہ ۔

ایذائیں دی جارہی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے راہ خدا میں کچھ مال دینے کا حکم دیا۔ اس وقت میرے پاس بہت مال تھا' میں نے آدھا مال راہ خدا میں دے دیا۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ اپنے اہل و عیال کے لیے کچھ مال چھوڑ کر آئے ہو؟ تو عرض کیا آدھا مال چھوڑ آیا ہوں' پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا تو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اہل و عیال کے لیے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کافی چھوڑا ہے۔

ع۔ صدیق کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

جب شروع بعثت میں یہ آیت نازل ہوئی کہ:

(ترجمہ) اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) احکام خداوندی کے لیے تکلیف برداشت کیجیے

تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ ابتدا نہ کریں کہیں قریش مشتعل ہو کر حملہ نہ کریں' اس لیے مجھے اجازت دیجیے کہ میں ابتدا کروں۔

چناں چہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک خطبہ قریش کے سامنے پڑھا' جس میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت' پھر شرک و بت پرستی کی مذمت تھی۔ خطبہ بہت موثر تھا لیکن کفار نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بہت زیادہ ایذائیں پہنچائیں' جو انہوں نے خوشی کے ساتھ قبول فرمائیں۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اسلام لانے کے بعد اپنے گھر کے سامنے ایک مسجد بنائی جو اسلام میں پہلی مسجد تھی۔ وہاں آپ ہر روز قرآن پاک (جتنا نازل ہوجاتا تھا)

تلاوت فرماتے' اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ ایک مرتبہ جب صحن کعبہ میں کفار قریش بیٹھے ہوئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا ذکر کر رہے تھے' اور اتفاق سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں پہنچ گئے تو ان لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو گھیر لیا اور گلے کی چادر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لپیٹ کر کھینچنا شروع کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو وہ حضورؐ کو بچانے کے لیے دوڑے۔ ان لوگوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر حملہ کر دیا جس سے کئی دن آپ بے ہوش رہے اور جب کبھی تھوڑا ہوش آتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت دریافت کرتے۔

نبوت کے ساتویں سال جب کفار قریش نے شعب ابی طالب میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خاندان کو تین سال تک محصور رکھا تو آپؓ بھی ان کے ساتھ رہے۔ اسی طرح ہر مشکل اور ہر جہاد میں بھی آپؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا۔

حضرت خدیجہؓ کا نکاح جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوا تھا اس وقت بھی آپؓ نے کوشش کی تھی اور جب حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوا تو آپؓ نے بہت ادب و اخلاص کے ساتھ اپنی صاحبزادی حضرت عائشہؓ کو حضورؐ کے نکاح میں پیش کیا۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معراج ہوئی تو سب سے پہلے آپ ہی نے تصدیق کی' اسی وجہ سے آپؓ کا لقب صدیق ہوا۔ پھر سفر ہجرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جس طرح ساتھ دیا اسکی تفصیل احادیث میں آتی ہے کہ کس کس طرح آپؓ نے ہر وقت کا سامنا کیا۔ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک چلنے سے زخمی ہو گئے تو آپؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شانے پر سوار کر کے غار ثور

اور جب کفار اس غار کے دہانے کے قریب پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ تک پہنچایا۔ کو سورۃ التوبہ میں بیان فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر آپؓ کو تسکین دی کہ :

لاتحزن إن اللہ معنا۔ (رنجیدہ نہ ہو، اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہے۔)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے انیس غزوات میں حصہ لیا۔ سب سے پہلا غزوہ بدر کا تھا۔ اور آخری تبوک کا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہر غزوہ اور ہر موقع پر ساتھ رہے اور جاں نثاری اور جاں بازی کے جو کارنامے پیش کیے ہیں وہ اسلامی تاریخ میں بہت اہم ہیں۔ غزوہ بدر میں جو ۱۷ رمضان ۲ھ کو پیش آیا، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے ایک عریش یعنی چادریں تان کر ایک سائبان بنا دیا گیا تھا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رات بھر تلوار لیے ہوئے عریش کا پہرہ دیتے رہے۔ اخیر رات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم دعا کر رہے تھے کہ "اے اللہ اپنا وعدہ پورا کر، اگر یہ تیرے فرماں بردار بندے یہاں شکست کھا جائیں گے تو پھر روئے زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے قراری دیکھی تو عریش کے اندر آکر عرض کیا کہ "یا رسول اللہ، بس اتنی دعا آپ کی کافی ہے"۔ اس بات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جونہی سر اٹھایا تو جبریل علیہ السلام وحی لے آئے کہ ان کافروں کو جلد ہی شکست دی جائے گی اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ دوسرے غزوات میں بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہمیشہ اور ہر حال میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سینہ سپر ہو کر رہتے تھے۔

پھر جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو طرح طرح کی رکاوٹ کھڑی

ہوئیں، بعض لوگ نبوت کے مدعی بن بیٹھے۔ ان میں مسیلمہ کذاب، عنسی اور سجاح وغیرہ کے قتل کا حکم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ہی نافذ فرمایا۔ ایک اور اہم واقعہ یہ تھا کہ حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری وصیت میں فرمایا تھا کہ اُسامہ کا لشکر ملک شام کی طرف روانہ کیا جائے، لیکن پر آشوب حالات کی وجہ سے تمام جلیل القدر صحابہؓ فی الحال اس لشکر کے بھیجنے میں پس و پیش کررہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ میری اونٹنی لاؤ میں خود مرتدوں کے قتال کے لیے جاتا ہوں اور اُسامہ کا لشکر ابھی روانہ ہوگا، خدا کی قسم اگر چیل کوے میرا گوشت نوچ ڈالیں تب بھی میں اس لشکر کو نہ روکوں گا جس کی روانگی کا حکم رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم دے گئے تھے۔ چناں چہ وہ لشکر فوراً روانہ ہوا، اور فتح و نصرت حاصل کرکے واپس ہوا۔ پھر بحرین، عراق، شام اور روم وغیرہ کی جنگوں کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بلا تکلف حکم دیا اور ہر جگہ فتح حاصل ہوئی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں قرآن پاک میں جو آیتیں نازل ہوئی ہیں ان میں سے ایک تو وہی سورۃ التوبہ کی آیت (۴۰) ہے جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ ثور پر کافروں کے غلبے کے وقت فرمایا تھا کہ "رنجیدہ نہ ہو، اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہے"۔

دوسری آیت سورۃ الفتح کی آیت (۲۹) ہے جس میں وہ اور ان کے ساتھیوں کے متعلق فرمایا ہے کہ "وہ کافروں پر بہت سخت اور آپس میں بہت نرم ہیں"۔

تیسری آیت سورۃ اللیل کی آیت (۱۸) ہے کہ "وہ بچایا جائے گا دوزخ کی آگ سے جو سب سے بڑا متقی ہے، جو اپنا مال دیتا ہے کہ ستھرا ہو"۔

چوتھی آیت سورۃ الحجرات (۱۳) کی کہ "تم میں خدا کے نزدیک زیادہ بزرگ وہ ہے جو اتقی ہو"۔ مفسرین کے نزدیک یہ آیت بھی آپؓ کی شان کو ظاہر کرتی ہے۔

پانچویں آیت سورۃ النور (۲۲) کی ہے کہ "جو تم میں بزرگی اور وسعت والے ہیں وہ اپنے قرابت والوں کو دینے سے انکار نہ کریں"۔

احادیث بھی بکثرت ہیں جن میں آپؓ کی فضیلتیں مذکور ہیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایسے صحابی ہیں جن کی چارپشتیں صحابی ہیں۔ یعنی ماں باپ بھی بیٹے بھی اور پوتے بھی۔

۲۲ جمادی الاخر ۱۳ھ کو آپؓ کا وصال ہوا' اسی وقت میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کوئی دردانگیز شعر پڑھا تو آپؓ نے فرمایا' "ایسا نہ کہو" بلکہ یہ آیت سورہ قٓ (۱۹) کی پڑھو کہ "آگئی غفلت موت کی' حق کے ساتھ یہی وہ چیز ہے جس سے اے انسان تو بھاگتا تھا۔

اِنّا للّٰہ و اِنّا الیہ راجعون ۰

"فرمایا حضرت صاحبؒ مدظلہ نے"

روحانیت کے سفر میں منزل کی دوری نہیں ہوتی۔

؎ طے شد جارۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

۵

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

(آہنگ ۔ ریڈیو پاکستان ۔ اگست ۱۹۸۸ء)

حضرت عثمان ابن عفانؓ کا نسب پانچویں پشت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ آپؓ کی ولادت واقعہ فیل سے ٦ سال بعد ہوئی اور آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رہنمائی سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسلام لانے کے بعد آپؓ کو قریش نے بہت ایذائیں پہنچائیں۔ خود آپؓ کے چچا نے آپ کو رسی سے باندھا اور کہا کہ "تم نے اپنے باپ دادا کا دین ترک کر کے نیا دین اختیار کیا ہے، میں تم کو اس وقت تک نہ کھولوں گا جب تک کہ تم اس نئے دین کو ترک نہ کردو"۔

آپؓ نے فرمایا کہ "اللہ کی قسم، میں دین اسلام کو ہرگز ترک نہ کروں گا"۔ آخر کار وہ ظالم عاجز آگیا اور پھر آپؓ کو رہائی ملی۔

آپ اسلام لائے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کا نکاح آپؓ کے ساتھ کردیا۔ اور جب کفار مکہ نے مسلمانوں کی ایذارسانی پر کمر باندھی تو آپؓ حضرت رقیہ کو لے کر ملک حبش ہجرت کرگئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "عثمانؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے بعد اپنے اہل بیت کے ساتھ ہجرت کی ہے"۔ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ملک حبش سے واپس مدینہ منورہ آگئے اور حضرت رقیہؓ کی جب وفات ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ میں اس کی بہن ام کلثوم کا نکاح عثمان سے کردوں"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیوں سے نکاح کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ "ذوالنورین" کہلائے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالی نے مالی خدمتیں بہت کی ہیں ۔ غزوہ تبوک کے موقع پر سامان جہاد کے علاوہ کھانے کا سامان (راشن) اس قدر دیا کہ کئی اونٹوں پر لادنا پڑا۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ایک مرتبہ چار دن سے فاقہ تھا۔ آپؓ کو معلوم ہوا تو کئی بوریاں آٹے اور گیہوں کی، کئی بوریاں کھجوروں کی، بکری کا گوشت، پکا ہوا کھانا اور تین سو دینار بھیجے۔

ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سخت قحط پڑا۔ آپؓ نے ایک ہزار اونٹ غلے کے لے کر تمام حاجت مندوں میں تقسیم کردیئے۔اسی طرح جب مدینہ منورہ میں میٹھے پانی کی سخت ضرورت تھی تو آپؓ نے ایک کنواں جو بیر رومہ کے نام سے اب بھی موجود ہے، ایک یہودی سے خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کردیا۔ اسی طرح مسجد نبویؐ کی توسیع کے لیے ایک زمین قریب پچیس ہزار دینار میں خرید کر شامل کردی ۔ اسی طرح کی مختلف سخاوتوں کی وجہ سے آپؓ کو غنی کا لقب حاصل ہوا۔

آپؓ کا عہد خلافت بارہ دن کم بارہ سال رہا۔ اس زمانے میں دو قسم کی فتوحات ہوئیں ۔ ایک تو وہ کہ بعض ممالک جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فتح ہوئے تھے اور ان کے بعد باغی ہوگئے تھے ان کو دوبارہ فتح کیا، دوسرے وہ جو اب فتح ہوئے۔ مثلاً" افریقہ کی وہ فتح جو حرب العبادِ اللہ کہلاتی ہے یعنی جس میں چار عبداللہ رضی اللہ شریک ہوئے۔ عبداللہ بن سعدؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ۔ انہوں نے افریقہ کے بہت بڑے علاقے کو فتح کیا۔ اس کے بعد طرابلس، اندلس اور مغرب کے بہت سے شہر قبضے میں آگئے ۔ دوسری فتح قیصر روم کے ساحلی مقامات کی تھی جس کے لیے سب سے پہلی بحری جنگ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت

عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مشورے اور اجازت سے کی ۔ قیصر روم اور ایران کا یزدگرد آپؓ ہی کے زمانے میں مارا گیا۔ اور ایران کے مقامات میں سے خراسان، جوین، بیہق، فیروز آباد، شیراز، طوس، ہرات، نیشاپور، اور بلخ وغیرہ فتح ہوئے ۔ غرض کہ فارس اور روم کی فتوحات کا تکملہ آپؓ کے ہاتھوں ہوا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں آخری چھ سال فتنہ پردازوں کی نذر ہوئے۔ حاکم مصر عبداللہ بن سراح تھا، اسی کی وجہ سے فتنوں کا آغاز ہو ۔ وہ وہاں بہت مظالم ڈھانے لگا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے تنبیہہ کی لیکن وہ باز نہیں آیا تو آپؓ نے اسے معزول کردیا اور اس کی جگہ محمد بن ابی بکرؓ کو حاکم مقرر کر کے مصر بھیجا اور یہ بھی فرمایا کہ عبداللہ بن سراح نے جو مظالم ڈھائے ہیں ان کی تحقیقات بھی کریں۔

جب وہ مصر کی طرف روانہ ہوئے اور ابھی چوتھی منزل پر ہی تھے کہ دیکھا ایک غلام بھاگا چلا آرہا ہے۔ اس سے پوچھا کہ تو کہاں جارہا ہے تو اس نے غلط بیانی سے کام لے کر باور کرایا کہ وہ حضرت عثمانؓ کا غلام ہے، اور اس کے پاس ایک فرضی تحریر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے منسوب کرکے پائی گئی ۔ اس تحریر کا مضمون یہ تھا کہ محمد بن ابی بکرؓ اور ان کے جو ساتھی مصر جارہے ہیں عبداللہ بن سراح کو چاہیے کہ ان کو قتل کردے اور خود حاکم بنا رہے۔ دراصل یہ فرضی اور جعلی تحریر مروان کی تھی جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قرابت دار تھا۔ بہرحال اس جھوٹ اور فریب سے بات بڑھتی گئی اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ٹھیک اس وقت شہید کیے گئے جبکہ قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھے اور ان کا روزہ بھی تھا، بڑی بیدردی سے شہید کیے گئے۔ یہ واقعہ ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کامل الحیاء والایمان ہیں ۔ یعنی حیا اور ایمان میں کامل

ہیں ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی حیا کی خاص طور پر تعریف فرمائی ہے اور بارہا ان کو جنت کی بشارت دی اور اپنی رفاقت کا مژدہ سنایا ہے ۔ ایک موقع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"میں اس شخص سے کیوں نہ حیا کروں جس سے فرشتے حیا کرتے ہیں"۔

حیا ہی کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی ضرورت کے موقع پر بھی کسی کو تکلیف نہ دیتے۔ کئی کئی لونڈی غلام آپؓ کے پاس ہوتے لیکن آپؓ کبھی ان سے کوئی خدمت نہ لیتے' پھر اگر کوئی شخص درشت کلامی کرتا تو آپؓ نرمی سے جواب دیتے۔ کسی کو قرض دیتے تو اس سے واپس نہ لیتے۔

آپؓ کے بکثرت دیگر فضائل بھی تھے۔ مثلاً" سوائے ممنوعہ ایام کے آپؓ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ شہادت کے دن بھی آپؓ کا روزہ تھا۔ آپ ہر روز تہجد میں پورا قرآن پاک ختم کیا کرتے تھے اور دن میں بھی اکثر تلاوت فرماتے رہتے تھے۔ آپؓ ایک مدت تک کاتب وحی رہے۔ عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ سابقین اولین میں سے تھے۔ صدقہ دینے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے ۔ ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد کرتے تھے ۔ اگر کسی جمعہ کو غلام نہ ہوتا تو دوسرے جمعہ کو دو غلام خرید کر آزاد کرتے ۔ جامع القرآن آپؓ اس لیے ہیں کہ شیخینؓ کے زمانے میں جو قرآن جمع کیا گیا تھا اسے آپ نے لغت قریش کے مطابق کتابت کرا کے تمام ملکوں میں بھیجا اور صحیح پڑھنے والے قاریوں کو بھی ساتھ بھیجا تاکہ ہر جگہ ایک ہی طرح پڑھا جائے ۔ پھر قرآن پاک میں جو ۵۴۰ رکوع ہیں وہ آپ ہی کے مقرر کردہ ہیں ۔ تاکہ رمضان المبارک کی تراویح کی بیس رکعتوں میں ایک ایک رکوع پڑھا جائے اور آسانی کے ساتھ ستائیسویں شب میں ختم کیا جائے۔ اللہ پاک بے شک آپ سے راضی ہے اور آپ ان سے راضی ہیں۔

ابو جعفر بن جریر طبریؒ

(آہنگ ریڈیو پاکستان ۱۹۸۰ء)

مسلمان مفسرین اور مورخین میں ابو جعفر محمد بن جریر طبریؒ ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ آپ طبرستان کے صدر مقام آمل میں ۲۲۴ھ/۸۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ اور چھوٹی سی عمر یعنی سات سال کی عمر میں حافظ ہوگئے اور دینی علوم بھی اسی زمانے میں حاصل کرلیے۔ لیکن گھر سے خوش حال تھے اس لیے مزید تعلیم کے لیے بلاد اسلامیہ کا سفر اختیار کیا، وہ بغداد بھی گئے تاکہ امام احمد بن محمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کریں لیکن وہ کچھ عرصے کے بعد یعنی ۲۴۱ھ/۸۵۵ء میں فوت ہوگئے۔ اس لیے طبری نے مصر اور شام کے علماء سے رجوع کرنے کے لیے سفر اختیار کیا۔ اور ایک عرصے مسلم ممالک کا سفر کرتے رہے آپ کے خاص علوم یہ تھے، تاریخ، تفسیر، فقہ، تجوید و قراءت، عروض، صرف و نحو، ریاضیات، اور علم ابدان۔

مصر سے واپسی پر آپ شافعی مذہب کے پیرو رہے اور امام احمد حنبلؒ کے فقہ سے کہیں کہیں اختلاف بھی کرنے لگے جس کی وجہ سے بہت سے حنابلہ ان کے درپے آزار ہوگئے اور مجبوراً آپ گوشہ نشین ہوگئے۔ اور آخر بغداد ہی میں ۳۱۰ھ / ۹۲۳ء میں آپ نے وفات پائی۔

ابن جریر طبریؒ کا مقام علم تفسیر میں بہت بلند ہوا۔ ان کی تفسیر کا پورا نام "جامع البیان فی تفسیر القرآن" ہے۔ وہ ابن منذر، ابن ابی حاتم، امام حاکم اور ابن حیان وغیرہ سب سے مقدم ہیں۔

اپنی تفسیر میں وہ یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ وہ ایک آیت کو نقل کرکے اس کے ایک ایک لفظ کے معنی لکھتے ہیں۔ متقدمین کے جو اختلافات ہیں ان کو اسناد کے ساتھ

درج کرتے ہیں۔ پھر ان میں سے جو بات خود کے نزدیک قابل ترجیح ہوتی ہے اس کو بیان کرتے ہیں۔ پھر اس کے دلائل قائم کرتے ہیں۔ آیات کے جملہ مفہوم اور مقصد کے لیے بھی ان کا یہی رویہ ہے۔ یعنی وہ متقدمین کے اقوال درج کرتے ہیں پھر خود ایک مفہوم کو اختیار کر کے اس کے لیے دلائل پیش کرتے ہیں، کہیں کہیں مسائل کے استنباط اور وجوہ اعراب سے بھی بحث کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ان کی تفسیر، اسلام میں پہلی تفسیر ہے جس میں مؤلف نے اپنی دماغی کوشش اور ذہنی کاوش سے بھی کام لیا ہے۔ اسی لیے وہ ہر موقع پر ایک انفرادی حیثیت سے ممتاز ہوتے ہیں۔ ان سے پہلے جو تفسیریں لکھی گئیں ان میں صحابہ کرامؓ تابعین اور ان کے بعد کے علماء کی روایات درج ہیں اور احتیاط کے طور پر ان مفسرین نے کوئی بات اپنی طرف سے نہیں لکھی۔ لیکن طبریؒ نے اپنا مقام سب سے الگ قائم کیا ہے اور ہر موقع پر تحقیق و تنقید دونوں سے کام لیا ہے۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ پوری امت کا اجماع ہے کہ ابن جریر طبری جیسی تفسیر کسی نے نہیں لکھی۔ امام ابو حامد اسفرائینی کا قول ہے کہ اگر کسی نے چین تک کا سفر کر کے صرف تفسیر طبری کو حاصل کر لیا تو وہ بھی بہت غنیمت ہے۔ اور اس نے کوئی زحمت نہیں اٹھائی۔

دراصل یہ تفسیر ہر لحاظ سے جامع اور مکمل ہے۔ اسے اُمّ التفاسیر بھی کہتے ہیں، کیوں کہ اس کے بعد جتنی بھی تفاسیر لکھی گئی ہیں وہ سب کے سب اسی سے ماخوذ ہیں۔ تاہم محققین کے نزدیک اس تفسیر میں ایک خامی بھی ہے وہ یہ کہ طبری نے رطب و یابس ہر قسم کی روایات درج کر دی ہیں، لیکن ہر روایات کے ساتھ انھوں نے اس کی سند بھی درج کر دی ہے اس لیے اس کے جانچنے اور پرکھنے میں بڑی مدد مل جاتی ہے۔ امام ابن تیمیہ کے شاگرد ابن کثیر نے اسی تفسیر کا خلاصہ کیا ہے اور اسی کی ضخیم

کر کے اپنی تفسیر مرتب کی ہے۔

طبری سے پہلے بھی چند تفسیریں لکھی گئی تھیں مثلاً " تفسیر ابن جریج، تفسیر سفیان بن عینیہ، تفسیر وکیع بن الجراح، تفسیر شعبہ، تفسیر ابوبکر بن ابی شیبہ وغیرہ۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے شیوخ سے قرآن کی تفسیر کے سلسلے میں جو روایتیں سنتے ان کو قلم بند کر لیتے تھے۔ صحاح ستہ میں بھی کتاب التفسیر کے ذیل میں یہی انداز ہے کہ جستہ جستہ الفاظ اور آیات کے متعلق جو روایات مل سکیں ان کو درج کر دیا ہے اور یہ روایتیں بالعموم صحابہ کرامؓ یا ان کے تلامذہ کی ہیں۔ بہت کم ایسی ہیں جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع ہیں، اور صحاح ستہ کے یہ ابواب اس قدر مختصر ہیں کہ کسی سورۃ کے ایک یا دو لفظوں یا آیتوں کے متعلق یہی روایات درج ہیں۔ اگرچہ یہ روایات قرآنی تفسیر کے لیے نہایت اہم ہیں لیکن چوں کہ وہ بہت کم ہیں اس لیے تشنگی رہ جاتی ہے۔ ان روایات کے بعد جب مسلمانوں میں مختلف قسم کی تحریکیں شروع ہوئیں اور صرف و نحو، بلاغت و معانی، فقہ و اصول، منطق و فلسفہ، کلام، [illegible]ف وغیرہ کا رواج ہوا تو ہر مفسر نے اپنے زاویہ نظر سے الفاظ و آیات کی تشریح میں بحثیں شروع کیں اور روایات کے ساتھ ساتھ اجتہاد کا دروازہ بھی کھول دیا۔ پھر نئے نئے فرقے بھی پیدا ہو رہے تھے اور فنی موشگافیوں میں مصروف تھے اس لیے ان مفسرین نے ان کے اعتراضات کے جوابات بھی اپنی تفسیروں میں شامل کر لیے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تفسیر کے یہ اصول طبری نے ہی قائم کر دیے تھے اور وہ ایک ایسے نہج پر تھے جس کے لیے کم از کم پندرہ علوم کی ضرورت تھی، یعنی لغت، اشتقاق، صرف و نحو، معانی، بیان، بدیع، قراءات، کلام (اصول دین) اصول فقہ، اسباب نزول، قصص، ناسخ و منسوخ، فقہ اور حدیث۔ یعنی ان تمام علوم کی مہارت جو بعد کے مفسرین کے لیے ضروری قرار دی جاتی ہے وہ بیک وقت طبری کے یہاں موجود ہے۔ پھر تفسیر نویسی کے لیے سب سے مقدم شرط مفسر کی دیانت

ہے کہ جب دنیا کے معاملات میں بھی غیر متدین کی بات تو کیا اس کی شہادت کا اعتبار نہیں کیا جاتا تو پھر دینی امور اور پھر بالخصوص قرآنی مطالب کے لیے ایسے شخص کا کیوں کر اعتبار ہو سکتا ہے۔ طبری کا کمال ہے کہ وہ مذکورہ علوم میں تبحر رکھتے ہوئے اس دیانت کے روشن مینار ہیں۔ وہ غیر مستند روایات سے گریز کرتے ہیں اور زیادہ تر وہی روایات لیتے ہیں جو تواتر کے ساتھ آتی ہیں۔

منقولات کی اس پابندی کی وجہ سے آج بھی ان کی تفسیر کو بڑی قدر و منزلت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے اور روایات کے معاملے میں ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

طبری کا ذکر نامکمل کہلایا جائے گا اگر ہم ان کی تاریخ کا ذکر نہ کریں۔ انھوں نے تاریخ عالم پر اپنی شہرہ آفاق کتاب تاریخ الرسل والملوک لکھی تھی۔ اس میں پہلے تو انبیاء علیہم السلام اور قدیم بادشاہوں کا ذکر ہے پھر ساسانیوں کی تاریخ ہے اور اس کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے آل و اصحاب کی تاریخ ہے جو ہر سال کے واقعات کے ذیل میں ہے، جسے توقیت کہتے ہیں۔ خاندان اُمیہ اور خاندان عباسیہ کی تاریخ بھی اسی طرح آتی ہے اور یہ ضخیم تاریخ چار دفتروں میں ختم ہوتی ہے۔ کتاب میں محرم ۳۰۲ھ جولائی ۹۱۵ء تک کے واقعات درج ہیں۔ یعنی اس کتاب کے سات سال بعد طبری نے بغداد میں وفات پائی۔

طبری کی اس تاریخ کے ذیل میں بطور ضمیمہ ایک اور کتاب تاریخ الرجال شامل ہے۔ یعنی ان محدثین کی تاریخ ہے جن سے طبری نے استفادہ کیا ہے۔ طبری کی اسناد کو سمجھنے کے لیے اس کتاب سے بڑی مدد مل سکتی ہے اور اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی تفسیر اور تاریخ کس حد تک مستند ہے۔

حکیم نکتہ سنج

ابن سینا

(آہنگ ریڈیو پاکستان ۱۹۸۴ء)

ابو علی حسین ابن عبداللہ ابن سینا صرف ابن سینا اور Avicenna کے نام سے تمام دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ شیخ الرئیس ان کا مشہور لقب ہے۔ بخارا کے قریب ایک گاؤں میں ۳۷۰ھ میں ان کی ولادت ہوئی' ان کا اپنا بیان ہے کہ انھوں نے دس سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرلیا تھا اور علم نحو اور علوم دینیہ کی مبادیات کی تکمیل کرلی تھی۔ ایک عالم عبداللہ ناتیلی سے انھوں نے استفادہ کیا لیکن اپنی غیر معمولی ذہانت اور ذکاوت کی وجہ سے تھوڑے ہی عرصے میں استاد کی حیثیت سے علماء کو درس دینے لگے۔ ریاضیات' طبیعات' منطق اور ماوراءالطبیعات کے ادق مسائل اور فن طب کی مہارت اسی نوعمری میں حاصل ہوگئی تھی اور وہ ابھی سترہ سال ہی کے تھے کہ مشرق و مغرب میں ان کی شہرت پھیل گئی تھی۔ بخارا کے امیر نوح بن منصور نے ان کو اسی زمانے میں ایک ایسے مریض کے علاج کے لیے طلب کیا تھا جس سے تمام اطباء مایوس ہوگئے تھے لیکن ابن سینا کے علاج سے وہ شفایاب ہوگیا تھا۔ امیر نے خوش ہوکر انھیں مالامال کردیا اور اپنا بیش بہا کتب خانہ ان کے سپرد کردیا' حاسدوں نے کتب خانہ جلاکر اس کا الزام ابن سینا پر رکھ دیا۔ نظامی عروضی کی روایت ہے کہ ابن سینا کو اس کتب خانہ کی اکثر کتابیں زبانی یاد تھیں اور انھوں نے املا کرکے ان کتابوں کو دوبارہ زندہ کردیا۔

امیر نوح بن منصور کی وفات ۳۸۷ھ میں ہوئی تو ابن سینا بخارا سے جرجان' خوارزم' خراساں' اور داغستان میں قیام کرتے رہے اور وہاں تدریس کا سلسلہ جاری

رکھا' جرجان میں ابن سینا نے اپنی مشہور کتاب قانون لکھنی شروع کی جس کی نظیر صدیوں میں بھی نظر نہیں آتی۔ یہ کتاب فن طب پر ایک اٹل کتاب ہے اور بکثرت انکشافات پر مبنی ہے۔ اسی کے نام پر Canon Law اسی قانون کو کہا جاتا ہے۔ جوائل ہے۔ جرجان سے ابن سینا کو ہمدان جانا پڑا کیوں کہ اس زمانے میں سیاسی افراتفری عام تھی۔ ہمدان کے امیر شمس الدولہ نے ان کو اپنا وزیر بنالیا۔ امیر کو آنتوں کی بیماری ہوئی تو ابن سینا نے کتاب شفا لکھی جو اس بیماری کے علاج اور تشخیص کے سلسلے میں بے نظیر ہے۔ شمس الدولہ کے انتقال کے بعد ابن سینا نے اصفہان کا رخ کیا اور وہاں کے امیر علاؤالدولہ کے ساتھ کچھ عرصے تک قیام کیا۔ بالآخر رمضان ۴۲۸ھ میں ان کی وفات ہوئی لیکن مرنے سے پہلے انھوں نے اپنا تمام مال و متاع اللہ کی راہ میں خیرات کردیا۔

ابن سینا جیسے ذکی' ذہین اور بلند پایہ مصنفین دنیائے اسلام میں بہت کم ہوئے ہیں۔ انھوں نے مختلف ذمہ داریوں کے باوجود ایک سو سے زیادہ کتابیں لکھیں ہیں۔ اور ان میں سے بعض ایسی ہیں کہ ان کے موضوعات پر آج تک اضافہ نہیں ہوسکا۔ ان کی کتاب قانون اور شفا کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے اور آج تک ان کا پڑھنا اور سمجھنا بہت بڑی استعداد والوں ہی کا کام ہے۔ کتاب الشفا مختلف علوم کا مخزن اور انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کی اٹھارہ جلدیں ہیں۔ بعض حصے یہ ہیں:

منطق' طبیعات' السماء والعالم' روح حیات حیوانی' عقل' فلسفۂ اولیٰ۔

ابن طفیل نے اپنی کتاب "حی ابن یقظان" میں لکھا ہے کہ ابن سینا نے شفا کی ابتدا میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ اس کتاب میں اس کے اصلی خیالات کا اندازہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی کتاب حکمت مشرقیہ کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ لیکن ابن سینا کی یہ کتاب مفقود ہے البتہ بعض متقدمین نے اس کا مطالعہ کیا ہے تو وہ بتاتے ہیں

۱۔ اس کتاب کا موضوع وجود المطلق ہے تمام فلاسفی تین قسم کے علوم میں تقسیم ہے

۱۔ اعلیٰ علوم جن کا مادے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ حکمت اولیٰ یا مابعد الطبیعات سے عبارت ہیں۔

۲۔ ادنیٰ یعنی وہ علوم جو مادہ کے ساتھ مخصوص ہیں یعنی وہ علوم ان اشیاء کے ساتھ مخصوص ہیں جن کی مادی حیثیت ہوتی ہے

۳۔ علوم وسطی یعنی وہ علوم جن کا تعلق مابعد الطبیعات کی ذات سے ہے اور مادہ سے بھی ہے۔ ایسے علوم ریاضیات سے متعلق ہیں جن کا تعلق براہ راست مادہ سے نہیں ہے لیکن مختلف حالات کے لحاظ سے مادہ سے ایک گونہ اتصال ضرور ہے۔ اسی طرح علم ہندسہ ہے کہ وہ ایسے موجودات سے مخصوص ہے جن کا تخیل بغیر مادی اتصال کے ممکن ہے گو کہ جس میں ان کا کوئی وجود نہیں یعنی بغیر مادی اشیاء کے ان کا قیام ممکن نہیں البتہ موسیقی، فلکیات، آلات اور علوم بصری کو مادہ سے قریبی تعلق ہوتا ہے اور ان میں سے جو علوم و فنون طبیعیات سے زیادہ قریب ہیں ان کی وقعت زیادہ ہے۔ بعض علوم خلط ملط ہو جاتے ہیں اور ان کی علیحدگی ممکن نہیں ہوتی، جیسے فلکیات ہے کہ وہ علم ریاضی ہے لیکن علم طبیعی کے اعلیٰ طبقے سے مخصوص ہے۔ مکلاہ کا خیال ہے کہ ابن سینا گو کہ ارسطو کی کتابوں سے مستفید ہوئے ہیں لیکن ان سے آگے بڑھ گئے ہیں کیونکہ ارسطو نے فلسفہ نظری کی تین قسمیں کی ہیں۔

۱۔ ریاضیات ۲۔ طبیعیات ۳۔ علم الہیات

اس لحاظ سے ارسطو نے ریاضیات کو فلسفے کی ایک شرح قرار دیا ہے اور ریاضیات سے ایسے فنون منسوب کیے ہیں جو متحرک بھی نہیں اور نہ مادہ سے جدا ہیں۔ اس کے بعد اس نے دوسرے علوم کا ذکر کیا ہے، جیسے فلکیات، مرئیات اور اجسام اور آلات کو طبیعیات سے منسوب کیا ہے۔ تاہم ارسطو کی یہ تقسیم ابن سینا جیسی تقسیم اور اس کی

تحقیق کے درجے کو نہیں پہنچی۔ ابن سینا نے نہ صرف علوم کی اعلیٰ تقسیم کی ہے بلکہ مختلف فلسفیانہ نظریات پر مفصل بحث کی ہے۔ انھوں نے ارسطو کی طرح وجود کے نظریے پر ممکن اور ضروری بحث بھی کی ہے لیکن چند مخصوص خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ ابن سینا نے بتایا ہے کہ موجودات کی تین قسمیں ہیں:۔

١۔ ایک تو وہ ہیں جو صرف ممکن کے ذیل میں ہیں یعنی پیدا ہو کر فنا ہو جاتی ہیں۔

٢۔ دوسری وہ ہیں جو ممکن کے ذیل میں ہیں لیکن ایک خارجی سبب سے ان میں وجوب پایا جاتا ہے یعنی وہ فانی ہونے کے باوجود باقی رہنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

٣۔ تیسری قسم اس ذات برتر تک محدود ہے جو بذاتہٖ واجب ہے اور اسے ہم اللہ کہتے ہیں۔ ابن سینا نے صرف اسی ذات برتر میں وجود' وحدت اور روح کے اتحاد کو تسلیم کیا ہے اور پہلی دو قسموں میں وحدت اور وجود کو حادث کہا ہے جو اشیاء کی روح پر عارض ہیں اور اس کے ساتھ متصل ہو جاتے ہیں۔

بہرحال ابن سینا اپنی ذکاوت [illegible] سے بے مثل [illegible] قرار دیے جاتے ہیں۔ وہ جن نظریات کو ایک بار ثابت کر دیتے ان میں پھر ترمیم و تنسیخ کی گنجائش نہ چھوڑتے اور کاٹ چھانٹ میں مطالعے، وقت صرف نہ کرتے یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام کی تمام تصانیف بہت اہم ہیں اور وہ [illegible] عین شباب میں لکھی گئی ہیں ان سے آج بھی اختلاف رائے بہت کم ہوا ہے۔

علامہ جرجانی اور دیگر مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ابن سینا کو جب کبھی کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا تو وہ وضو کر کے جامع مسجد کا رخ کرتے اور نماز نفل پڑھ کر خدا سے اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے دعا مانگتے۔ اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا ایمان ان کی ذکاوت کا ایک جزو تھا اور وہ اس قدر بلند و ارفع مقام پر ہوتے ہوئے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے رجوع ہوتے اور اسی سے استمداد طلب کرتے۔

ابن سینا کی ذکاوت اور نکتہ سنجی کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ وہ شروع جوانی ہی سے اپنے فیصلے پر اٹل تھے اور ابتداء میں جن علوم کی وہ تحصیل و تکمیل کر چکے تھے اس پر کسی اضافے کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔ غرض کہ ان کی فطرت سلیم، روشن بصیرت اور قوی ارادے نے ہمیشہ ان کے ایمان میں پختگی نور شن کے عمل میں وحدت پیدا کی۔ اسی لیے ان کی کتابوں کی اہمیت اور افادیت شروع سے اب تک ہر دور میں مسلّم رہی ہے۔

"فرمایا حضرت صاحب مدظلہ نے"

بندہ جب شکر ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اور دیتا ہے۔

"رب" کے لفظ میں بڑی کشش ہے اور اس کے معنی وہ ذاتِ باری ہے جو ہر چیز کو جسے اس نے پیدا کیا ہے، کمال کی حد تک پہنچا دیتی ہے۔ (غور کرنے کی بات ہے)

مولانائے رومؒ

(آہنگ ریڈیو پاکستان ۱۹۸۴ء)

جلال الدین محمد جو "مولانائے روم" کے لقب سے زیادہ مشہور ہیں۔ بلخ میں ۶۰۴ھ مطابق ۱۲۰۷ء میں پیدا ہوئے۔ وہاں کے امیر علاؤالدین محمد خوارزم شاہ کو آپ کے والد بہاؤالدین ولد سے غالباً ان کے علمی وقار اور وجاہت کی وجہ سے عداوت تھی۔ اس لیے وہ جلد ہی اپنے صاحب زادے وغیرہ کے ساتھ بلخ سے کوچ کر کے نیشاپور چلے گئے۔ وہاں شیخ فریدالدین عطار کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے جلال الدین محمد کو گود میں اٹھالیا، خوب دعائیں دیں اور ان کے عظیم المرتبت ہونے کی پیشین گوئی بھی فرمائی، پھر اپنی مثنوی الٰہی نامہ بھی ان کو پیش کی۔ نیشاپور میں رہنے کے بعد یہ پورا خاندان بغداد، مکہ معظمہ ہوتا ہوا قونیہ چلا گیا۔ وہاں جلال الدین محمد کی شادی ۶۲۵ھ مطابق ۱۲۲۸ء میں ہوئی۔ دو بیٹے علاؤالدین اور بہاؤالدین پیدا ہوئے اور وہیں مولانا کو ان کے پیر شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری نصیب ہوئی۔ مولانا کے بڑے بیٹے اور پیر شمس تبریزؒ دونوں قونیہ کے ایک فساد میں قتل کر دیے گئے۔ مولانا وہیں قونیہ میں رہے۔ اور ۶۷۲ھ مطابق ۱۲۷۳ء میں وہیں فوت ہوئے۔

مولانا کی یادگار ایک دیوان ہے جو ان کے پیر کے نام سے "دیوان شمس تبریز" مشہور ہے۔ تصوف پر ایک رسالہ "فیہ ما فیہ" ہے، لیکن سب سے زیادہ شہرت ان کی مثنوی کی ہے جس میں ۶ دفتر ہیں اور (Nicholson) والے ایڈیشن میں ۵۹۰ اشعار ہیں۔ اس مثنوی کے متعلق یہ مشہور شعر اس کی عظمت اور شہرت کے لیے ہر شخص کے ورد زبان ہے کہ

ـــــو مثنوی معنوی مولوی ہست قرآن در زبان پہلوی

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس مثنوی میں بکثرت آیات قرآنی کی تلمیحات ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس میں ۳۰۲ آیات کی تلمیحات کے کئی کئی مقامات ہیں اور احادیث ان کے علاوہ ہیں۔

مثنوی کی سلاست، روانی اور برجستگی کا یہ عالم ہے کہ اس کے بعد بکثرت شعراء نے اس کا تتبع کیا اور علامہ اقبالؒ نے خاص طور پر اس مثنوی کی پیروی میں کئی مثنویاں لکھیں اور اس مثنوی سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنے "فلسفہ سخت کوشی" کی تبلیغ بھی کی۔ علامہ اقبالؒ کی مثنوی اسرار خودی جو مولانا ہی کی زمین میں ہے۔ مولانا کے دیوان کے ان اشعار سے شروع ہوتی ہے کہ۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر — کزدام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زیں ہم رہان ست عناصر دلم گرفت — شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

گفتند یافت می نشود، جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

یعنی کل ایک بزرگ، دن کے وقت چراغ لیے گھوم رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میں حیوانوں سے تنگ آگیا ہوں اور انسانوں کو ڈھونڈتا ہوں۔ میں اپنے ست ساتھیوں سے تنگ آگیا ہوں اور میں شیر خدا اور رستم کی تلاش کر رہا ہوں۔

لوگوں نے کہا ہم تو بہت ڈھونڈ چکے، انسان تو کہیں ملتا نہیں۔ وہ بزرگ بولا کہ "جو نہیں ملتا اسی کو تو میں ڈھونڈتا ہوں"۔

چنانچہ یہی سخت کوشی، پیہم جستجو، مسلسل تلاش رومیؒ کا خاص پیام ہے۔ جس کا خلاصہ ایک مصرع میں آگیا ہے کہ

؎ کوشش بے ہودہ بہ از خفتگی

یعنی اگر یہ بھی معلوم ہو کہ اب کوشش کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، تب بھی کوشش کرنی چاہیے جو سو رہنے سے بہتر ہے۔ یعنی زندگی اور زندہ رہنے کا ثبوت ہی کوشش

میں مصروف رہتا ہے۔ مولانا ایک اور شعر میں بہت خوبی کے ساتھ اس پیام کو پیش کرتے ہیں کہ ؎

تشنگاں گر آب جویند از جہاں　　آب ہم جوید بہ عالم تشنگاں

یعنی دنیا میں پیاسے لوگ اگر پانی کی تلاش کرتے ہیں تو پانی خود پیاسوں کی تلاش میں رہتا ہے کیوں کہ دنیا کی ہر چیز انسان کے لیے بنائی گئی ہے لیکن اسی انسان کے لیے جو ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔

"فرمایا حضرت صاحب مدظلہ نے"

اللہ پاک متقیوں اور اس سے ڈرنے والوں ہی کا عمل قبول فرماتا ہے۔ اس کی بارگاہ میں عاجزی اور انکساری سے اپنی درخواست پیش نہ کریں گے تو کس طرح ہمارے کام بن سکتے ہیں۔

بابا فرید گنج شکرؒ

(آہنگ - ریڈیو پاکستان - اکتوبر ۱۹۸۳ء)

حضرت بابا فریدالدین مسعود "گنج شکر" کا سلسلہ نسب حضرت عمرفاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے - اور آپ کابل کے بادشاہ فرخ شاہ کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت مجددالف ثانی علیہ الرحمہ بھی اسی خاندان سے تھے۔

باباصاحب کا اسم گرامی فریدالدین تھا اور لقب گنج شکر اس لیے ہوا کہ آپ کی والدہ ماجدہ آپ کو نماز کا پابند بنانے کے لیے آپ کے مصلے کے نیچے شکر کی ایک پڑیا رکھ دیتی تھیں اور فرماتی تھیں کہ جو بچے نماز پڑھتے ہیں ان کے مصلے کے نیچے شکر کی پڑیا ملتی ہے۔ اس طرح آپ بچپن ہی سے عبادت اور ریاضت سے شغف رکھنے لگے اور یہ شغف اس قدر بڑھا کہ نوعمری میں ہی آپ کو" زُہدالانبیا" بھی کہا جانے لگا۔ اسی زمانے میں آپ اپنے خالہ زاد بھائی حضرت زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ان کے پیر حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ سے نیاز حاصل کرنے کے لیے بغداد تشریف لے گئے۔ وہاں حضرت شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تھے کہ حضرت کے وضو کا وقت ہوا تو بابا صاحب وضو کرانے آگے بڑھے' دیکھا تو حضرت کی ڈاڑھ میں سخت درد تھا۔ باباصاحب نے وہ درد اپنی ریاضت شاقہ کی برکت سے سلب کرلیا۔ حضرت کو فوراً" سکون ملا۔ حضرت نے بہت دعائیں دیں لیکن فرمایا' افسوس کہ تمہارا حصہ میرے پاس نہیں ہے۔ البتہ میں اپنی کتاب "عوارف المعارف" تم کو ہدیہ کرتا ہوں۔ اس طرح یہ کتاب بابا صاحب ہی کی وجہ سے ہمارے برصغیر پاک و ہند کو نصیب ہوئی۔

باباصاحب نے حفظ قرآن اور تعلیم ظاہری کی تکمیل کے بعد حضرت قطب الدین

بختیار کاکی رحمہ اللہ علیہ سے بیعت کی سعادت حاصل کی اور ملک کے طول و عرض میں دین کی تبلیغ کے لیے سیاحت فرمائی۔ اسی لیے آج تک مختلف شہروں میں آپ کی قیام گاہیں "تکیوں" کے نام سے مشہور ہیں۔ باباصاحب آخر میں اجودھن یعنی موجودہ پاک پٹن میں قیام پذیر ہوئے۔

باباصاحب ایک رباعی پڑھ رہے تھے اور جھوم رہے تھے' آپ کے مرید حضرت بدرالدین اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ دروازے پر بیٹھے ہوئے نگرانی کررہے تھے۔ انھیں کسی ضرورت سے باہر جاناپڑا تو حضرت نظام الدین اولیارحمۃ اللہ علیہ سے انھوں نے عرض کیاکہ بھائی صاحب آپ یہاں دروازے پر بیٹھ جایئے۔ حضرت نظام الدینؒ بیٹھے ہی تھے کہ باباصاحب کی نظران پر پڑی تو ہاتھ اٹھ گئے اور بارگاہ الٰہی میں عرض کیاکہ "الٰہی نظام الدین را محبوب گرداں" اس وقت سے حضرت نظام الدین اولیاء "محبوب الٰہی" مشہور ہوئے۔ جب آپ دہلی میں تھے تو حضرت سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتیؒ نے آپ کے لیے دعا کی تھی کہ "خدایا ہمارے فرید کو قبول فرما"۔

باباصاحب کے وصال کی تاریخ ۵ محرم ۶۶۴ھ کہی جاتی ہے۔ حضرت قطب جمال ہانسویؒ حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت مخدوم علاؤالدین صابر کلیریؒ آپ کے خاص خلفاء ہیں جن کے فیوض وبرکات آج بھی جاری و ساری ہیں۔ آپ کے بعض اقوال سے تبلیغ اسلام اور حسن اخلاق کے جو اسباق حاصل ہوتے ہیں' ان کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ آپ فرماتے ہیں کہ:۔

☆ جیسی تمھاری حقیقت ہے ویسا ہی اظہار کرو۔ یعنی تصنع اور بناوٹ کے قریب بھی نہ جاؤ۔

☆ اگر کچھ ہے تو غم نہیں اور اگر نہیں ہے تب بھی غم نہیں۔

☆ لذت نفس کے لیے قرض لینے سے بہتر یہ ہے کہ فاقہ سے مرجائے۔

☆ جس چیز کے لیے کوشش کرو اسے انتہا تک پہنچاؤ۔

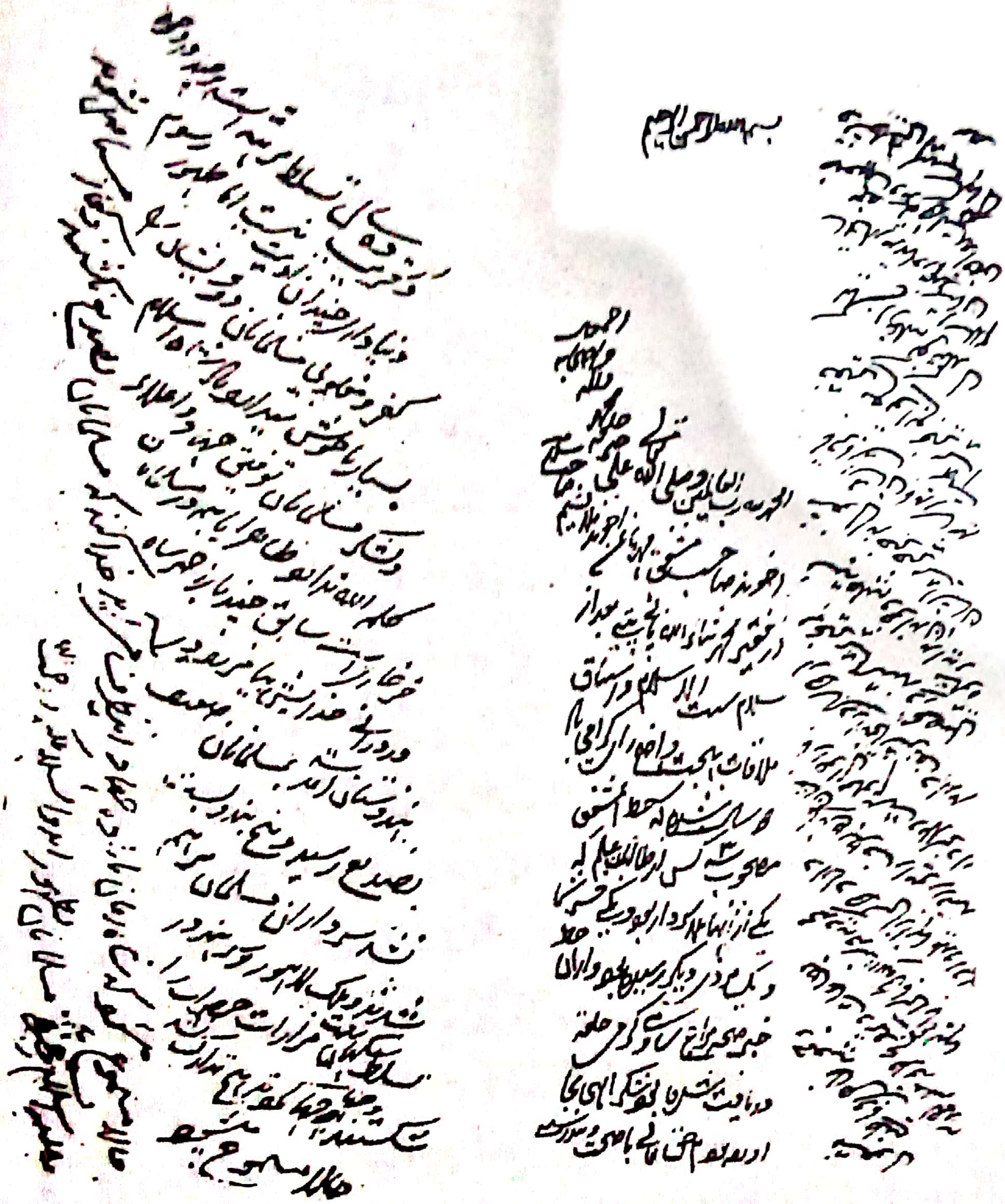
مکتوبات قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ

(ماہنامہ اردو۔ کراچی۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء)

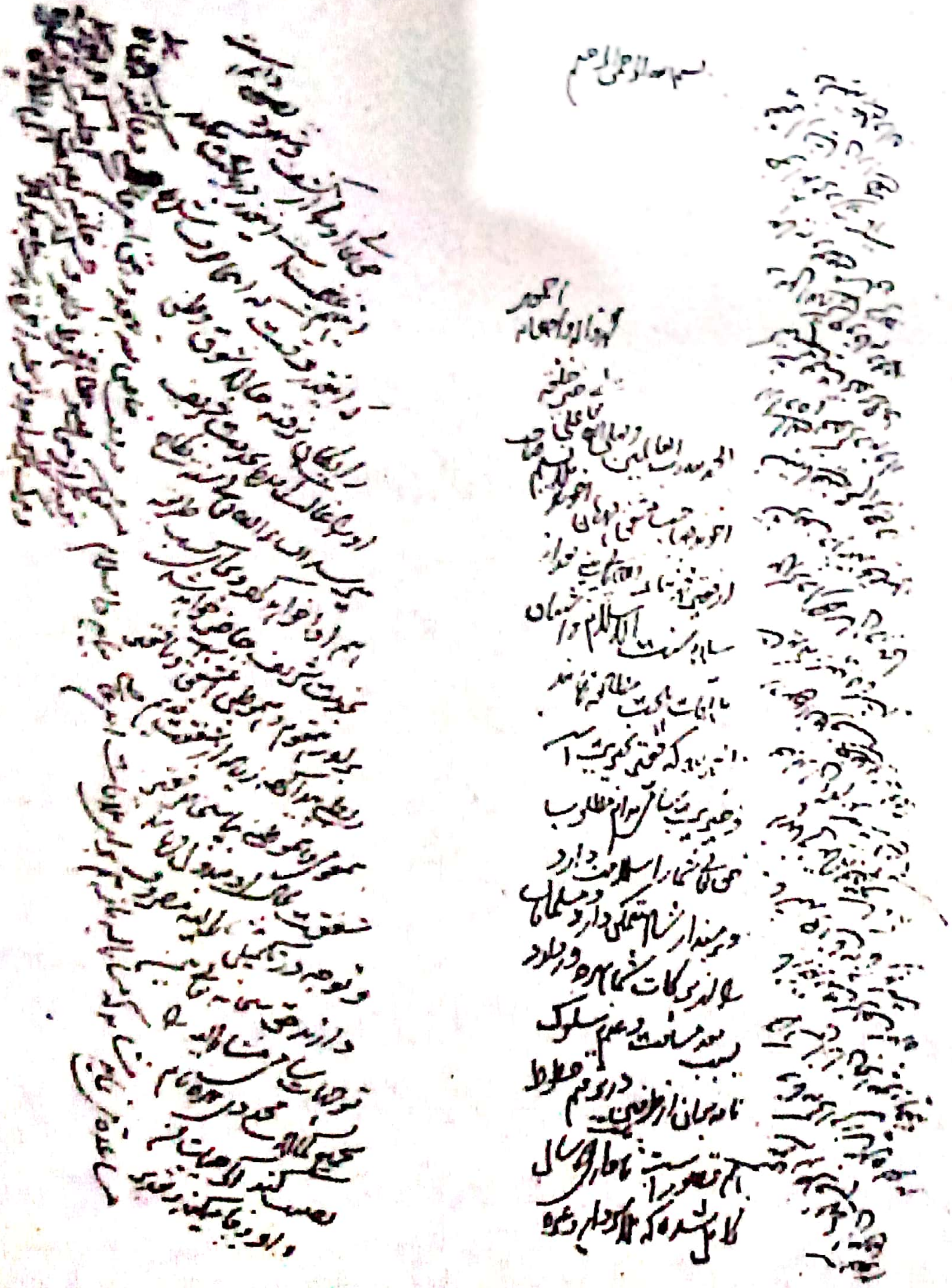
حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۲۲۵ھ) کے چار غیر مطبوعہ مکتوبات یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ (۱) پہلے مکتوب میں ملا محمد نسیمؒ کے "عنایت نامے" کے پہنچنے کا ذکر ہے کہ اس کے ساتھ ایک تسبیح اور نافہ مشک بھی موصول ہوا۔ دوسرے مکتوب میں ہے کہ ملا سردار کے ساتھ ملا محمد حنیف اور ملا زبردست بھی آئے تھے لیکن موخرالذکر دو حضرات (جن میں سے ایک ملا محمد نسیمؒ کے خسر تھے) پانی پت سے رام پور چلے گئے۔ اسی مکتوب میں یہ بھی ہے کہ حضرت مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ صاحبہ کئی سال تک پانی پت میں قیام پذیر رہیں اور اب چھ ماہ سے دہلی میں ہیں۔ یہ بھی ہے کہ مرزا شاہ علی (۲) (حضرت مظہرؒ کے متبنیٰ) عرصہ ہوا فوت ہوچکے ہیں اور ان کے بڑے صاحب زادے میاں مداری میرے پاس ہیں اور چھوٹے صاحب زادے میاں نظامی اپنی والدہ کے ساتھ عظیم آباد۔(پٹنہ) میں اپنے ماموں کے یہاں ہیں۔ صاحب زادی اہمند کا عرصہ ہوا نکاح کردیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ شاہ علی کی دوسری بیوی سے جو بچہ تھا، وہ اور اس کی ماں بھی فوت ہوچکی ہے۔ اسی مکتوب میں حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۲۴۰ھ) کے متعلق ہے کہ وہ مسند ارشاد پر متمکن ہیں اور ایک عالم ان سے مستفیض ہورہاہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ حضرت قاضی صاحب کے بڑے صاحب زادے احمد اللہ (المتوفی ۱۱۹۸ھ) اور دوسرے صاحب زادے صبغۃ اللہ بھی عرصہ ہوا کہ فوت ہوچکے ہیں۔

---

(۱)۔ سلسلے کے لیے دیکھیے "ماہنامہ اردو" بابت جولائی ۱۹۶۷ء مضمون حضرت میرزا مظہر جان جاناں کے غیر مطبوعہ خطوط۔(۲)۔ اردو مکتوبات کے صفحہ ۲۰۲ میں ہے کہ "شاہ علی ان کا (اہلیہ کا) ایک حصہ ہونے کے باوجود فقیر کا طرف دار ہے۔"


بسم الله الرحمن الرحیم

مکتوب ۲ از قاضی محمد ثناء الله پانی پتی.



مکتوب ۲ از قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی

تیسرے مکتوب کے آخر میں حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مہر ۱۲۲۶ھ کی لگی ہوئی ہے(۱)۔ اور ملا سردار کے متعلق لکھا ہے کہ وہ دو سال سے یہاں ہیں اور ہدایہ اور مشکوٰۃ وغیرہ پڑھ رہے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ مکتوب نمبر۲ جس میں ملا سردار کی آمد کا ذکر ہے' ۱۲۱۴ھ کا ہوگا۔ اسی مکتوب میں ہے کہ احمد شاہ درانی (۲) کئی مرتبہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا لیکن اس سے مسلمانوں کو زیادہ ضعف ہوگیا' کیونکہ مسلمانوں کے سردار منتشر ہوگئے اور سکھوں نے لاہور کے علاوہ سرہند پر بھی قبضہ کرلیا۔ اور وہاں کے مزارات کو بھی توڑ دیا۔ اب سنا ہے کہ شاہ امان اس طرف جہاد کی غرض سے آنے والا ہے۔

اس کے بعد ہی چوتھا مکتوب لکھا گیا ہوگا۔ جس میں ملا سردار کا ذکر ہے کہ وہ دو سال تک یہاں رہے اور صاحبزادہ دلیل اللہ سے کتابیں پڑھیں۔ یہ بھی ہے کہ اب ملا سردار وطن جارہے ہیں تاکہ شادی کرلیں' آپ انہیں "توجہ" دیں۔ وہ چار مکتوبات یہ ہیں:۔

۱۔ الحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ و اصحابہ اجمعین ۔

مولوی صاحب مشفق مہربان اخوند ملا محمد نسیم صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ سلامت۔ فقیر حقیر محمد ثناء اللہ پانی پتی بعد از سلام سنت الاسلام و نیازمندیہا و اشتیاق ملاقات بہجت آیات کثیر البرکات واضح رائے گرامی میگرداند الحمد للہ کہ فقیر مع متعلقان بخیرو عافیت ست و بدعائی ترقیات و درجات و کثرت برکات صاحبان مشغول و از کثرت گناہان خائف و بہ آخر رسیدن عمر و ضایع شدن آں در امور لاطائل نادم و پشیمان و بدستگیری کردن صاحبان بدعائی حسن، خاتمہ و مغفرت ذنوب ملتجی است امینونی یا عباد اللہ الصالحین

---

(۱)۔ فارسی مکتوبات کے صفحہ ۲۳۰ میں ہے کہ قاضی صاحب یہ اپنی مہر اپنے پاس رکھتے تھے۔(۲)۔درانی کو دردرانی لکھا ہے۔

بالدعاء یغفرا للّٰہ تعالیٰ لی ولکم ویرحمنا للّٰہ تعالیٰ وایاکم عنایت نامہ سامی مع سبحہ و نافہ مشک رسیدہ بر سروچشم نہادم حق تعالیٰ بایں الطاف و مہربانیہا سلامت دارد' وملاقاتہائی مستوفی باہم در فردوس اعلیٰ و دارالوصول المعلیٰ میسر آرد و ملفا لک علی اللہ بعزیز' والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد البشیرالنذیر و علیٰ جمیع الانبیاء والمرسلین و علی الملٰئکۃ المقربین و علیٰ اٰل محمدؐ و اصحابہ اجمعین و علیٰ جمیع عباداللّٰہ الصالحین۔

برخورداران گرامی قدر محمد جیو و غلام محمد وغیرہما و والدات شان و جمیع یاران طریقہ سلام مطالعہ نمایند و بر شریعت و طریقت و محبت مشائخ مستقیم باشند۔

۲۔بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ۰

الحمد للّٰہ رب العالمین و صلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیرخلقہٖ محمدؐ و علی اٰلہٖ و اصحابہٖ اجمعین ۰

اخون صاحب مشفق و مہربان اخون ملا محمد نسیم جیو سلمہ ربہ سلامت' بعد از سلام سنت الاسلام و اشتیاق ملاقات بہجت آیات مطالعہ فرمایند' الحمدللّٰہ کہ فقیر بخیریت ست و محمد دلیل اللّٰہ و محمد صفوہ اللّٰہ پسر مولوی احمداللّٰہ مرحوم بفضل الٰہی بخیریت اند و مولوی احمداللّٰہ مرحوم و محمد صبغتہ اللّٰہ مرحوم از مدتہا رحلت کردہ بودند شنیدہ باشند بی بی صاحبہ قبلہ والدہ مرشدہ اہلیہ حضرت ایشان شہید رضی اللہ عنہ از چند سال در پانی پت تشریف میداشتندحالا از شش ماہ در شاہ جہان آباد تشریف میدارند مرزا شاہ علی را مدت مدید شد کہ رحلت کردند دو پسر گذاشتہ اند یکی میاں مداری در پانی پت در فقیر خانہ تشریف دارند و میاں نظامی پسر خورد ایشان مع والدہ خود در عظیم آباد پٹنہ نزد خال خودہستندو بی بی امتہ دختر مرزا شاہ علی از مدتے نکاح کردہ دادند۔ و پسر خورد شاہ علی کہ از اہلیہ دوم بود فوت شدہ و مادر اوہم نیست و از یاران حلقہ میاں محمد مراد صاحب و مولوی غلام علی صاحب و

میاں عبدالباقی صاحب و میاں محمد احسان صاحب بخیریت اند۔ و میاں محمد احسان در رام پور اند و دیگر صاحبان در شاہ جہان آباد۔ مولوی غلام علی صاحب بر مسند ارشاد نشستہ اند۔ عالمے از ایشان مستفید می شوند، مولوی محمد صدیق صاحب از مدتے رحلت کردہ اند، ملا محمد حنیف و ملا زبردست و ملا سردار صوفیان آں مہربان بخیریت بے نہایت رسیدند و خط آں مہربان رسانیدند از ادراک احوال شریف بسیار خوشنودی حاصل شد، الحمد للہ کہ بر مسند ارشاد نشستہ عالم را منور بسازند، فقیر را در وقت صافے بدعائے حسن خاتمہ یاد می آوردہ باشند و بودن چہار پسر و سہ صبیہ دو مستورات ہم معلوم شد، و ملا محمد حنیف و ملا زبردست از پانی پت بطرف رام پور روانہ می شود، راہ شاہ جہان آباد مخلوے ست، ارادہ شاہ جہان آباد نکردہ اند۔ اگر فرصت می یابند برائے مرزا حضرت ایشان از رام پور بشاہ جہان آباد خواہند رفت و الا ارادہ وطن خواہند کرد۔ عرضی و بوریائی مصلی و سہ مشک نافہ و یک کاسہ چوبی و سہ تسبیح زیتون کہ برائے والدہ مرشدہ تحفہ فرستادہ بودید۔ ملا محمد حنیف نزد فقیر گذاشتہ روانہ رام پور شدند۔ عرضی و اجناس تحفہ مذکورہ ہرگاہ کسے معتبر روانہ دہلی خواہد شد بدست او فرستادہ خواہد شد و دو تسبیح کہ بہ فقیر فرستادہ بودند رسید ملا سردار چند روز در پانی پت نزد فقیر ارادہ اقامت دارند بعد ازیں باید دید، از طرف محمد دلیل اللہ و محمد صفوۃ اللہ سلام و نیاز مطالعہ فرمایند۔ محمد صفوۃ اللہ بفضل الٰہی کتاب ہائی صرف و نحو خواندہ است حالا کتاب ہای منطق می خواند۔

۳۔ الحمد للہ رب العالمین و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

اخوند صاحب مشفق مہربان اخوند ملا نسیم صاحب سلامت از فقیر محمد ثناء اللہ پانی پتی بعد از سلام سنت واشتیاق ملاقات بہجت واضح رائی گرامی باد، دو سال شدہ کہ خط آں مشفق مصحوب سہ کس از طالب علم کہ یکے از آنہا ملا سردار بود و یکے خر شا و یک ...

. . . بوده و ازان خط فرحت تمام و گرمی علاقه دریافت شده بود، قدر الهی جا
آورده بود. حق تعالی با صحت و قدرتی و جمعیت ظاهری و باطنی مشغول بطاعات و ترویج
طریقه علیه احمدیه مجددیه رحمه الله تعالی با سرار اعمال ما دارد. دو کس از آنجا [illegible]
ماده بطرف رام پور رفته. تا را احوال شان معلوم نیست و ما سردار از دو سال در اینجا
تشریف دارند. و [illegible] در تحصیل [illegible] علم و خواندن [illegible] و [illegible] مشغول اند.
[illegible] ایشان [illegible] ایشان را رسانیده. الخیر فی ما وقع [illegible] لیکن از قلب [illegible]
تنگدل. سابق از مدتها در هندوستان اسلام ضعیف بود و حالا که طائفه روافض و [illegible]
[illegible] سکهان بود و از قریب ده سال تسلط مرهته است. هرچند در [illegible] چندان
اهمیت نیست. اما ظهور رسوم کفره مطالبه مسلمانان و [illegible] ایشان را بسیار [illegible] می دارد
پادشاه اسلام و لشکر مسلمانان توفیق جهاد و اعلاء کلمة الله ندارند. ظاهرا یا هم در مسلمانان
گرفتاری ست. سابق چند بار احمد شاه درانی خدا ابقاه با مراد در هندوستان آمده و
مسلمانان ضعف تصدیع رسیده و هیچ بندوبست نشد سرداران مسلمان برهم شدند و ملک
لاهور و سرهند در تسلط (۱) سکهان رفت. مزارات حضرات را شکستند چاه ها کردند هیچ
تدارک نشد. حالا مسموع می شود که شاه امان بارادهٔ جهاد این طرف می آید. خدا کند که
مسلمانان تصدیع نکشند و کفار مستاصل شوند و غلبه اسلام و عزه مسلمانان بظهور آید.
والسلام علیکم و رحمة الله.

مهر ثناء الله ۱۲۱۲ھ

بسم الله الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العالمین و صلی الله تعالی علی خیر خلقه محمد و آله و اصحابه اجمعین

---

(۱) در ۱۱۷۷ھ مطابق ۱۷۶۳ء

بگرامی حکیم صاحب از فقیر محمد شاه

مخدوم صاحب مشفق مهربان مخدوم ما

بعد از سلام سنت الاسلام و اشتیاق ملاقات محبت مطالعه فرمایند الحمد لله که
خیریت ست و خیریت سامی مدام مطلوب. حق تعالی شما را سلامت دارد و به جمله
ارشاد حسنی دارد و مسلمانان را از برکات شما بهره ور دارد. به حسب امر حسنات و عموم
سلوک خود بیان از طرفین در ترقیم خطوط هم قصور است. تا چهار ده سال کامل شده که
مواد و قیود سے کسی از طرف ... آمد بعده و خود گرامی رسانیده بعده در کسی ال
به مرام خود رقعه باز خدمت رسیده باشد جواب خود ثانی بدست آنها فرستاده بودم و شاید
که بعد ازاں هم بدست کسے دیگر رفته آں طرف خطے فرستاده بودم شاید که رسیده باشد
طالب مواد در سال در جا شریف حضرت تحصیل نسبت باطنی هم رنج در اوائل ...
کرده در کتب شریعت تدریس خود و دلیل ادله شرح وقایه و بعضے هدایه و بعضے مشکوة
شریف خوانده بسیار خوب است فقیر را ازایشاں راضی است و نسبت علمی دارد حق تعالی
او را از کشف و شهود تحقیق داده است ایں هم نعمت است ایں قدر سعادت می کرد که
ایں قدر وقت که اینجا صرف شده رایگان نرفته حالا شوق وطن او را غالب آمد
بخدمت شریف می رسد انشاء الله تعالی حسب ثقال هم ادا خواهد کرد برائے کسب طریقه
بخدمت شریف حاضر خواهد شد بعده هم قوم و هم وطن (شما) ست و با فقیر ربطے پیدا
کرده زیاده از شفقت قدیم هم قومی و هم وطنی بپاس خاطر فقیر شفقت حال او مبذول
فرمایند و توجه در تکمیل حضرت ایشاں مصروف دارند. حق سبحانه تعالی همیں توجهات سامی
حضرت ایشاں را جمیع کمالات حقیقی بهره تام نصیب کند. اگر حیات هست و او دعا می کند

تقریر مسافت می تعلیم شاید که حضرت ایشاں باز هم ملاقات ایں عاصی علیه والسلام۔

مشفق من در وقت خاص بعد تهجد در حق ایں عاصی دعا کنند که الله تعالی بقیه عمر
به خوبی و سلامتی گذرانده و حسن خاتمه نصیب کرداند که عمر با خیر رسید و مرگ در
کرد و قدم آخرت به دست نیک کرد کند اکرم الاکرمین و کمترین فقیر۔

ولیٔ کامل

حضرت بابا سید محمد تاج الدینؒ ناگپوری

(تذکرہ تاج الاولیاء - کراچی - ۱۹۶۵ء)

حضرت بابا صاحبؒ نہایت روشن ضمیر باکرامت بزرگ تھے۔ اس مختصر مضمون میں چند کرامتیں ہی پیش کی جاسکتی ہیں۔ بابا صاحبؒ کا فیض عام تھا اور حلقہ ارادت میں مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی کثرت سے تھے۔ سُکر کی حالت سے صحو میں آجاتے تو شریعت کی پابندی فرماتے۔ اخلاق مثالی تھا۔

حضرت بابا صاحبؒ مہاراجا کے محل کے شیر اور خونخوار درندوں کے پنجروں میں داخل ہو کر ان کو کھلاتے اور ان کے سروں پر ہاتھ پھیر کر واپس باہر تشریف لاتے۔

۱۔ تحصیل دار عبدالغفار صاحب سے معلوم ہوا کہ حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں ایک بدعقیدہ شخص آزمائش کے طور پر توجہ کا طلب گار ہوا۔ بابا صاحب نے اسے منع فرمایا۔ جب اس نے بہت زیادہ اصرار کیا تو حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا۔ "تاج الدین کی توجہ سے تو پہاڑ بھی پھٹ جاتا ہے۔" آپ کے یہ فرمانے کے ساتھ ہی اس کا خون بہہ نکلا اور وہ ختم ہوگیا۔ بابا صاحبؒ نے فرمایا۔ "مٹی تھا مٹی میں ملادو"

۲۔ جناب قطب الدین صاحب قادری اور ان کے بھائی بدرالدین صاحب اپنے عہد شباب میں حضرت باباصاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جوانی میں جس طرح عام آدمی کا حال ہوتا ہے وہی ان حضرات کا حال تھا۔ ایک روز تہجد کے وقت حضرت باباصاحبؒ نے بہت دور سے ایسی توجہ فرمائی کہ ان ہردو حضرات کی دنیا ہی بدل گئی۔ شریعت کے پابند ہوگئے۔ قطب الدین صاحب قادری سلسلے میں بیعت ہوئے اور خلافت بھی پائی۔

۳۔ ایک خستہ حال بیل گاڑی والا اپنی بیل گاڑی میں جارہا تھا اتفاقاً اس کا گزر

باباصاحبؒ کے سامنے سے ہوا۔ دور سے ہی باباصاحبؒ کو دیکھ کر دل میں خیال کر رہا تھا کہ باباجی توجہ فرما دیں تو میرے حالات بہتر ہو جائیں۔ جیسے ہی وہ قریب آیا سرکار نے ایک مردہ کتے کی طرف اشارہ کر کے اٹھانے کے لیے حکم دیا۔ تعمیل حکم میں گاڑی میں کتے کو ڈال لیا۔ تھوڑی ہی دور گیا ہو گا کہ اسے خیال ہوا کہ کتے کو پھینک دوں۔ جیسے ہی اس نے کتے کو ہاتھ لگایا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں بجائے مرے ہوئے کتے کے ایک رقم سے بھری ہوئی تھیلی ہے۔ حضرت باباصاحبؒ کے سامنے کبھی کسی کو عرض معروض کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی تھی۔ اور نہ آپ کسی کو خصوصی طور پر مخاطب فرماتے۔ بلکہ حاضرین کے جوابات اجتماعی طور پر اپنی روشن ضمیری سے عنایت فرمایا کرتے۔ سائل اپنے اپنے جوابات پاکر مطمئن واپس ہوتے۔

آپ سے بے شمار کرامات ظہور میں آئیں۔ ہزاروں غیر مسلم صاحب ایمان ہوئے آپ کی خدمت میں دنیا کے گوشے گوشے سے حاجت مند حاضر ہوتے اور بامراد لوٹتے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بزرگان دین اور اولیاء اللہؒ کی کرامات کو منطقی استدلال یا اشیاء کے خواص و افعال کے تحت پرکھنا اور سمجھنا محال ہے۔ یہ ایک مخصوص قوت ہے جو بارگاہ الٰہی سے اس کے مقبول اور پسندیدہ بندے کو عطا کی جاتی ہے اور یہ بندے اس عطیہ الٰہی سے ایسے وقت کام لیتے ہیں جب اس کے اظہار کے سوا چارۂ کار باقی نہیں رہتا۔ اولیائے کرام سے بیشتر کرامات کا صدور اعلاء کلمۃ الحق، احکام الٰہی کی سربلندی، اور اشاعت اسلام ہی کے سلسلے میں ہوا ہے۔ اپنی ذات کے لیے اپنی کرامات کے زور سے اعلیٰ ملبوسات، عالی شان عمارات اور لذیذ مطعومات اللہ کے بزرگوں نے کبھی تیار نہیں کیے۔ وہ اپنی عطیہ

الٰہی کو حرص و ہوا کی تکمیل میں صرف کرنا گناہ عظیم سمجھتے تھے۔ انھوں نے لذیذ کھانوں کی بجائے جنگل کے پھلوں اور پتوں پر گذارہ کیا۔ محلات و ایوان کے بجائے جھونپڑیوں اور پیڑوں کے سائے میں زندگی گزاری۔ خلعت شاہی کی بجائے مرقع اور گدڑی سے ستر پوشی کی۔ اس لیے کہ انکا نصب العین صرف یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی اس ودیعت کو اس راہ میں نمایاں کیا جائے اور اس راہ میں اس سے کام لیا جائے۔

علمی اختراعات اور مسلمان مفکرین

علم تفسیر

(آہنگ۔ ریڈیو پاکستان۔ ۱۹۸۳ء)

قرآن پاک کا نزول قریب ۲۳ سال ہوتا رہا۔ اور اس کے بعض مقامات تو کیا اکثر مقامات حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو سمجھائے۔ چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دس صحابہؓ خصوصیت کے ساتھ قرآن کے افہام و تفہیم کے سلسلے میں امام سمجھے جاتے ہیں۔ وہ خلفائے اربعہ کے علاوہ عبداللہ ابن مسعودؓ، عبداللہ ابن عباسؓ ابی ابن کعب، زید ابن ثابت، ابوموسیٰ اشعری اور عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہم ہیں۔

یہ ایسے بزرگ ہیں جنھوں نے قرآن پاک کی تفسیر کے سلسلے میں حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک بات کو محفوظ رکھا اور جو کچھ بیان فرمایا وہ ہر شخص کے نزدیک بالکل صحیح اور معتبر ہے۔ ان کے بعد دوسرا طبقہ تابعینؒ کا ہے جنھوں نے ان دس صحابہؓ سے بڑی احتیاط کے ساتھ قرآن پڑھا ہے۔ ان میں سے مجاہدؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کو تیس مرتبہ قرآن سنایا ہے، یعنی تیس مرتبہ پڑھ کر ایک ایک بات ان سے سمجھی ہے۔ تابعینؒ کے بعد تبع تابعین کا طبقہ ہے جو اپنے مطالعے اور اپنے مباحث میں بہت محتاط تھے۔ اور وہ صرف اسی بات کو صحیح سمجھتے تھے جو انھیں تابعین کے ذریعے صحابہ کرامؓ سے پہنچی تھی۔ ان کے بعد جو طبقہ آتا ہے وہ بھی خاصا محتاط ہے اور اس طبقے میں ابوجعفر محمد بن جریر طبریؒ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، کیوں کہ ان کی تفسیر خالص منقولات پر مبنی ہے اور کہیں کسی اور روایت کی آمیزش نہیں۔ یہ ابن جریر اس ابن جریر سے مختلف ہیں جو غیر مستند روایات سے بھی

کام لیتا تھا۔ اس طبقے کے بعد جو مفسرین آئے ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اسناد کے بغیر روایات نقل کرتے ہیں اور ان کے یہاں غلط سلط بہت واقع ہوا ہے۔ پھر پانچویں صدی ہجری کے مفسرین ہیں، جن میں ابو عبدالرحمٰن محمد بن حسین نیشاپوری (صاحب تفسیر حقائق) اور ابو اسحٰق احمد ثعلبی زیادہ مشہور ہیں۔ لیکن روایات میں ان کے یہاں رطب و یابس پایا جاتا ہے۔ اور ان کے بعد قرطبی، فخرالدین رازی وغیرہ آئے جن کے یہاں منطق و فلسفہ زیادہ ہے. اور روایات اور منقولات کم ہیں۔ پھر امام راغب اصفہانی اور ابو حامد محمد غزالیؒ کا زمانہ آتا ہے جنھوں نے بہت کچھ احتیاط سے کام لیا ہے۔

علم تفسیر میں ہمارے متقدمین نے منقولات کو روایات صحیحہ کے مطابق لکھا ہے اسی لیے ان کی ہر بات صحیح اور مستند سمجھی جاتی ہے لیکن متاخرین نے یا تو صرف حوالہ پر ہی اعتماد کیا ہے یا بغیر کسی حوالے کے خوش اعتقادی سے کام لیا ہے بلکہ بعض مواقع پر انھوں نے اسرائیلی روایات سے بھی کام لے کر اپنی کتاب کو بے اعتبار بنادیا ہے۔ اور بعض نے متاخرین کی یہاں تک تقلید کی کہ جو کچھ ان لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یا ان کے صحابہ کرامؓ سے منسوب کردیا ہے اسے ایسا یقینی جانا کہ پھر تحقیق کرنے کو بھی برا جانا۔ بلکہ جو لوگ متاخرین کی روایات کی تحقیق کرتے ہیں انھیں ناپسند کیا۔ پھر ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہوا جس نے تحقیق و تنقیح پر اس قدر زور دیا کہ صحیح روایات اور مستند احادیث کو بھی درایت کی رو سے جانچنا شروع کیا اور بے دین فلاسفہ اور ملحدین کی تقلید میں صحیح روایات کا مذاق بھی اڑانا چاہا۔ غرض کہ اس طرح افراط و تفریط کی وجہ سے اچھے اور مفید کام کے ساتھ غیر محتاط لوگوں کی کتابیں بھی معرض وجود میں آگئیں جن سے کوئی مفید کام نہ ہوسکا۔

بہرحال ایسی مستند تفاسیر کی کمی نہیں جن سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق قرآن کو سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً" تفسیر ابن جریر طبری، مجمع البحرین

سیوطی' تفسیر ابی اللیث' تفسیر ابن کثیر' تفسیر اسحٰق بن راہویہ (راہ وے)۔ تفسیر خوارزمی' تفسیر جوینی' تفسیر احمد یوسف موصلی اور تفسیر قشیری وغیرہ۔ ان کے علاوہ جار اللہ زمخشری کی تفسیر کشاف' بیضاوی کی تفسیر انوار التنزیل' عبدالرحمٰن نسفی کی مدارک التنزیل' امام فخرالدین رازی کی تفسیر کبیر' تفسیر بحر مواج (شمس الدین دولت آبادی)۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی تفسیر مظہری' شاہ ولی اللہ کی فتح الخبیر' شاہ عبدالقادر کی موضح القرآن وغیرہ ہمارے یہاں زیادہ مشہور ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ تفسیر وہی صحیح اور معتبر ہے جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا ہو اور کوئی بات صحاح ستہ سے ہٹ کر نہ ہو۔ جن لوگوں نے اپنی دماغی اختراعات سے کام لیا' یا موجودہ حالات کے پیش نظر نص قرآنی کے مفہوم ہی کو بدلنے کی کوشش کی وہ ہرگز قابل اعتنا نہیں ہیں بلکہ علم تفسیر کے لیے وبال ہیں۔

دو قومی نظریہ

اور

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ

(الطاہر۔ حیدر آباد۔۱۹۹۵ء)

لفظ "قوم" کے مخصوص معنی تو بعد میں مقرر ہوئے ہیں۔
ورنہ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دو قومی نظریہ ازل سے قائم ہے۔
قرآن پاک میں صرف دو جماعتیں بتائی گئی ہیں۔ سورۃ التغابن (آیت۔۲) میں ارشاد ہے:۔

هو الذی خلقکم فمنکم کافرٌ و منکم مؤمن ط واللّٰہ بما تعملون بصیر o

"وہ اللہ ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا۔ پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن ہے اور اللہ خوب دیکھتا ہے جو کچھ تم عمل کرتے ہو"۔

یعنی عمل سے کافر اور مومن کی تفریق ہوتی ہے۔ پھر سورۃ المجادلہ (آیت۔۲۲) میں ارشاد ہے:۔

لاتجد قوماً یؤمنون باللّٰہ والیوم الاٰخر یوآدون من حآدّ اللّٰہ و رسولہٗ ولو کانوآ اٰبآءھم او ابنآءھم او اخوانھم او عشیرتھم ط اولٰٓئک کتب فی قلوبھم الایمان وایدھم بروحٍ منہ ط ویدخلھم جنّٰتٍ تجری من تحتھا الانھار۔ خالدین فیھا رضی اللّٰہ عنھم و رضوا عنہٗ اولٰٓئک حزب اللّٰہ الآ انّ حزب اللّٰہ ھم المفلحون o

"جو قوم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہے تم اس کو ایسا نہیں

پاؤ گے کہ وہ محبت کرے ان سے جنھوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی
مخالفت کی اگرچہ وہ ان کے باپ ہوں یا بیٹے ہوں یا ان کے بھائی ہوں
یا ان کے رشتہ دار ہوں، یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے
ایمان نقش کر دیا۔ اور اپنی روح سے ان کی تائید فرمائی ہے۔ وہ ان کو
باغوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ان میں
ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے اور وہ اس سے راضی۔ یہ حزب اللہ (اللہ
کی جماعت) ہے۔ یاد رکھو، اللہ کی جماعت ہی فلاح پانے والی ہے"۔

اس حزب اللہ کے خلاف حزب الشیطان ہی ایک جماعت ہے جس کا ذکر سورۃ المجادلہ (آیت۔ ۱۹) میں اس طرح آتا ہے:۔

استحوذ علیھم الشیطان فانسٰھم ذکراللّٰہ ط اولٰٓئک حزب الشیطان
ط الآ انّ حزب الشیطان ھم الخاسرون ٥

"شیطان نے ان پر قابو پالیا ہے۔ پس اس نے ان کو اللہ کی یاد سے
غافل کر دیا ہے۔ یہ حزب الشیطان (شیطان کی جماعت) ہے۔ یاد
رکھو شیطان کی جماعت ہی گھاٹے میں آنے والی ہے۔"

گویا قرآن میں حق و باطل کی جماعتوں کا نام حزب آیا ہے ورنہ قوم کا لفظ حضرت یوسف علیہ السلام کے گیارہ بھائیوں کے لیے بھی استعمال ہوا۔ سورہ یوسف (۹) میں ہے۔

نز اقتلوا یوسف او اطرحوہ ارضاً یخل لکم وجہ ابیکم و تکونوا من
بعدہٖ قوماً صالحین ٥

"یوسف علیہ السلام کو قتل کر دو، یا کسی زمین میں پھینک آؤ (آبادیوں سے دور) تاکہ تمہارے باپ کی توجہ تمہاری طرف ہی رہے اور اس کے بعد تم صالح قوم ہو جانا۔"

یعنی گیارہ آدمی کی چھوٹی جماعت بھی قوم کہلائی گئی اور بہت بڑی جماعت کو بھی قوم کہا گیا ہے کہ اس قوم میں سے امت بھی تھی۔ جیسا کہ سورۃ الاعراف (آیت۔۱۵۹) میں فرمایا گیا ہے:-

ومن قوم موسیٰ اُمّۃ یھدون بالحق وبہ یعدلون ٥

"اور موسیٰ کی قوم میں سے ایک امت (گروہ) ہے جو حق کی راہ بتاتی ہے اوراس سے انصاف کرتی ہے۔"

پھر مسلمانوں میں سے بھی ایک جماعت کو قوم کہا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۃ النسآء (آیت۔ ۹۲) میں ہے:-

فان کان من قوم عدولکم وھو مؤمن۔۔۔

"پھر وہ اگراس قوم میں سے ہو جو تمہاری دشمن ہے اور مسلمان ہے۔

یعنی قوم وہ جماعت بھی ہو سکتی ہے جو مسلمان تو ہو لیکن تمہاری دشمن ہو۔ اس تمہید کا خلاصہ یہ ہوا کہ قرآن پاک میں چھوٹی بڑی جماعت کو بھی قوم کہا گیا ہے خواہ اس کا تعلق دین سے ہو یا نہ ہو۔ پھر یہ لفظ امتداد زمانہ سے ہم خیال لوگوں کی جماعت کے لیے بھی استعمال ہونے لگا اور علاقائی یا جغرافیائی تعلق والوں کے لیے بھی رائج ہو گیا لیکن برصغیر میں حق و باطل کے جو معرکے ہوئے ہیں ان کی وجہ سے حزب اللہ اور حزب الشیطان دو جماعتوں کو دو قوموں کا نام دیا گیااور اس طرح دو قومی نظریہ وجود میں آیا۔

برصغیر پاک و ہند میں سندھ کو باب الاسلام کہا جاتا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں سیستان فتح ہو گیا تھا۔ لیکن

یہاں کی بغاوتوں کو دور کرنے کے لیے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ (صحابی) نبرد آزما ہوئے اور ان تمام علاقوں کو مسخر کرلیا جو آج کل مکران اور سیستان میں شامل ہیں۔ ۸۶ھ میں دمشق کے تخت پر ولید اموی متمکن ہوا اور اس کی طرف سے مذکورہ بالا علاقوں میں نگرانی کرنے کے لیے حجاج کو مقرر کیا گیا۔ اسی زمانے میں لنکا میں کچھ عرب تاجر فوت ہوئے تو وہاں کے راجا نے ان کی عورتوں اور بچوں کو ایک جہاز میں سوار کراکے عراق روانہ کیا۔ راستے میں دیبل کے قریب ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کیا تو حجاج نے راجا داہر (حاکم سندھ) کو لکھا کہ ان سب کو میرے پاس بحفاظت بھیج دو۔ راجا نے معذرت کی کہ ان ڈاکوؤں پر میرا بس نہیں ہے، لیکن اسی زمانے میں اس نے مکران کے کچھ باغی عربوں کو پناہ دی تھی اس لیے انکی سرکوبی کے لیے حجاج نے اپنے نوعمر بھتیجے محمد بن قاسمؒ کو روانہ کیا جس نے ۹۳ھ میں سندھ پر حملہ کیا اور تین سال کے عرصے میں ملتان سے کچھ اور وہاں سے مالوہ کی سرحد تک قبضہ کرلیا۔ لیکن ۹۶ھ میں جب ولید کی جگہ سلیمان تخت نشین ہوا تو اس نے محض ذاتی عناد کی وجہ سے محمد بن قاسمؒ کو واپس بلالیا اور آخر قتل کردیا۔ بہرحال فتح سندھ دراصل فتح اسلام ہے کیوں کہ اسی زمانے سے اسلام باقاعدہ برصغیر میں داخل ہوا لیکن اس کے بعد قریب تین سو سال تک باہر سے کوئی ایسی تحریک نہیں اٹھی جو اسلام کی شمع روشن کرتی۔

تیسری صدی ہجری کے آخر میں جب خلافت عباسیہ میں زوال آیا تو (ایشیائی) ترکستان میں سامانی خاندان کی ترک سلطنت قائم ہوئی جس کے ایک غلام الپتگین نے چوتھی صدی ہجری میں غزنین میں اپنی حکومت قائم کی۔ پھر جب ۳۶۶ھ میں سبکتگین نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اس وقت کابل اور پشاور کا علاقہ پنجاب کے راجا جے پال کے قبضہ میں تھا۔ اس نے ملتان اور غزنین کے درمیان ۳۶۹ھ میں سبک

تگین پر حملہ کیا لیکن ہار گیا۔ پھر اس نے شمالی ہندوستان کے تمام ہندو راجاؤں کو متحد کر کے پشاور میں سبک تگین سے مقابلہ کیا۔ لیکن تمام ہندو راجاؤں کو بری طرح شکست ہوئی۔ پھر پہلی بار ایک مسلمان امیر ۳۷۰ھ میں پشاور میں متعین ہوا۔ اس کے بعد محمود کا زمانہ آتا ہے۔ جس نے غزنین سے ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے ہندوستان پر متعدد حملے کیے، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس نے کبھی ظلم و تشدد کو روا نہیں رکھا۔ بلکہ سومنات میں بھی بت شکنی کے علاوہ کہیں کشت و خون (جنگ کے علاوہ) نہیں کیا۔ راجاؤں کے فتنے کے علاوہ قرامطہ کا فتنہ بھی محمود کے ہاتھوں فرو ہوا جن کا ورود ۳۷۰ھ سے ملتان اور سندھ میں ہو چکا تھا اور ملتان کے قرامطہ نے محمود کے خلاف ان ہندو راجاؤں کی مدد بھی کی تھی، محمود نے ان سب کو مار بھگایا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے حملوں کی وجہ سے باطل کے بہت سے فتنے ایک مدت تک کے لیے سر نہ اٹھا سکے۔ اسی زمانے سے بہت سے بزرگان دین نے اس ملک میں تبلیغ شروع کی۔ شیخ اسمٰعیل، شیخ صفی الدین گازرونیؒ، شیخ فخرالدین زنجانیؒ اور حضرت داتا گنج بخشؒ وغیرہم محمود کے حملے کے بعد ہی اشاعت اسلام کے لیے برصغیر تشریف لائے۔

محمود غزنوی نے ہندوستان میں اسلامی حکومت کا کوئی مستحکم انتظام نہیں کیا تھا اس لیے اس کے جانے کے بعد باطل نے پھر سر اٹھایا اور ۵۸۸ھ میں معزالدین غوری کے مقابلے میں ترائن (تراوڑی) کی جنگ میں پرتھوی راج کے ساتھ ایک سو پچاس ہندو راجاؤں نے شرکت کی۔ لیکن یہ سب بری طرح ہار گئے اور مسلمانوں کی حکومت دہلی سے اجمیر تک قائم ہو گئی۔ پھر محمد غوری تو واپس غزنین چلا گیا لیکن اس نے اپنے قائم مقام قطب الدین ایبک کو ہندوستان میں متعین کیا جس نے جلد ہی گجرات، گوالیار، اور بیانہ وغیرہ کو بھی فتح کر کے اسلامی حکومت کو وسیع کر لیا۔

اسی زمانے میں کھوکھر قوم کا فتنہ بھی سر اٹھائے ہوئے تھا۔ یہ لوگ نیلاب

(سندھ) اور سوالک کی پہاڑیوں کے درمیان رہتے تھے۔ مسلمانوں کو قتل کرنا ان کا شیوہ تھا۔ دختر کشی ان کے یہاں عام تھی۔ بہت سی بے ہودہ رسموں میں وہ مبتلا تھے۔ ۶۰۲ھ میں محمد غوری نے ان کا زور توڑا تھا۔ لیکن وہ وطن جارہا تھا تو کھوکھروں کے رفیق ایک اسمٰعیلی فدائی نے دریائے جہلم کے قریب اس کو شہید کردیا۔

پرتھوی راج ہی کے زمانے میں سلطان الہند خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ (م ۶۳۳ھ) کا ورود مسعود اجمیر میں ہوا۔ وہ آپ کے خلاف تھا اور آپ کے ایک عقیدت مند کو اس نے ایذا پہنچائی تھی۔

حضرت کی زبان مبارک سے نکلا "پتھورا را زندہ گرفتیم و داریم" اسی موقع پر پتھورا (پرتھوی راج) مارا گیا اور غلبہ ختم ہوا۔ حضرت سلطان الہند رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسی روشن شمع ہیں جس سے ایک عالم مستفید ہوا۔ اور آپ ہی کی بدولت ہندوستان کے طول و عرض میں اسلام کو فروغ ہوا۔ پھر سلطان شمس الدین التتمش (م ۶۰۷ھ) کی بیٹی رضیہ کے زمانے میں قرامطہ نے پھر سر اٹھایا لیکن دہلی میں ان کی بری طرح سرکوبی ہوئی۔ دس سال تک حکومت کرنے کے بعد رضیہ کی جگہ ایک خدا ترس بادشاہ یعنی ناصرالدین محمود تخت نشین ہوا جس کا وزیر غیاث الدین بلبن تھا۔ دراصل حکومت وہی چلاتا تھا۔ ناصرالدین محمود کے انتقال (۶۶۴ھ) کے بعد بلبن ہی تخت نشین ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس نے میواتیوں کا فتنہ بھی ختم کیا اور فتنہ مغول کو بھی روکنے کے لیے بڑے سلیقے سے کام لیا' تاہم بلبن میں "عجمی اور ایرانی اکاسرہ" والی شان تھی اور اولیائے کرام کی موجودگی کے باوجود عوام کا رجحان عیش و طرب کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ پھر علاؤالدین خلجی (م ۷۱۶ھ) بادشاہ ہوا تو وہ بھی اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا وہ نماز پنجگانہ سے بھی محروم تھا بلکہ نماز جمعہ بھی اسے نصیب نہ تھی۔ البتہ اس کے بعد جب محمد تغلق (م ۷۵۲ھ) تخت نشین ہوا تو اس نے شعائر اسلام پر زور دیا' نماز کے معاملے

میں سخت گیر ہوا۔ اور تمام غیر شرعی محصول منسوخ کردیے۔ اس کے بعد فیروز شاہ تغلق(م ۷۹۰ھ) بادشاہ ہوا۔ اس زمانے کے واقعات فتوحات فیروز شاہ(الیٹ۔ جلدسوم) میں ملتے ہیں کہ "زندیقوں کا ایک گروہ مستقل طور پر زندقہ اور الحاد کی ترغیب دیا کرتا تھا۔ شراب ان کے یہاں عام تھی جس کے دور چلتے تھے تو پھر ماں، بیٹی اور بیوی کی تمیز اٹھ جاتی تھی۔ امامیہ فرقہ تبرا کرتا تھا۔ ایک احمد بہاری الوہیت کا دعویٰ کرتا تھا۔ ایک شخص رکن الدین مہدویت کا داعی تھا۔" بادشاہ نے ان تمام خرافات کی بیخ کنی کی، ناجائز محصول ختم کیے اور زکوٰۃ اور عشر کو قائم کیا۔

اس کے بعد اس کی اولاد میں بابر(م ۹۳۷ھ) کا زمانہ آتا ہے۔ تاریخ میں ہے کہ اس نے راناسانگا اور ہندوستان کے دوسرے راجاؤں کی مجموعی قوت کا ۹۳۳ھ میں مقابلہ کیا اور ان کو شکست فاش دینے کے بعد شراب ترک کردی۔

بچپن میں بابر نے حضرت خواجہ عبیداللہ احرارؒ (م ۸۹۵ھ) کے خلیفہ قاضی عبداللہ (عرف خواجہ مولانا) کی خدمت میں تربیت پائی تھی اس لیے اس کا تعلق دین سے تھا اور اس کا بیٹا ہمایوں(م ۹۶۳ھ) عجمی اثرات کے باوجود دین سے ذاتی طور پر تعلق رکھتا تھا۔ لیکن اس کا بیٹا اکبر بالکل جاہل اور ان پڑھ تھا۔ اسی لیے (مفاد پرست) علماء سوء نے اسے غلط راستے پر ڈال دیا۔ مزید یہ کہ اس نے ہندو رانیوں سے شادیاں کیں۔ اس وجہ سے اسے ہندو دھرم اور ہندو معاشرے سے زیادہ محبت ہوگئی۔ حتیٰ کہ اس نے شیخ سلیم چشتیؒ کا مقبرہ بنایا اور فتح پور سیکری کی مسجد بنوائی تو وہ بھی(بقول مستشرقین کے) ہندوانہ طرز کی ہے۔ اکبر کی خوشامد میں ملا مبارک ناگوری (فیضی اور ابوالفضل کے باپ) نے ۹۸۷ھ میں ایک محضرنامہ تحریر کیا جس میں یہ فقرے تھے:۔

"بادشاہ ظل اللہ ہے، امام عادل ہے، مجتہد العصر ہے اور دین کا پابند نہیں۔"

ملا عبدالقادر بدایونی نے اس زمانے کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ بعض لوگ

اکبر کے خاص مشیروں یعنی فیضی اور ابوالفضل کی حمایت میں بدایونی کی ہربات کی تردید کرنا چاہتے ہیں۔(۱)اور محض اسی مقصد کی وجہ سے وہ آنکھیں بند کرکے حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ (م ۱۰۳۴ھ)کی دینی خدمات کو بھی پس پشت ڈالنا چاہتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اس دور کے کئی فتنوں کے خلاف نبرد آزمائی کی۔ وہ لوگ جو خلفائے ثلاثہ اور حضرت عائشہؓ سے بغض رکھتے ہیں اور قرآن پاک میں ان کے مقامات عالیہ کی صراحت کے باوجود انکی شان میں گستاخی کرتے ہیں اور اسی گستاخی کو اپنا دین لکھتے ہیں، حضرت مجددؒ نے ایسے لوگوں کے خلاف لکھا(۲)اور ابوالفضل نے جو نبوت کے منافی اثرات اکبر پر ڈال رکھے تھے اس کے خلاف ایک عربی رسالہ "اثبات النبوۃ" لکھا جس میں اس دور کے فتنوں کا ذکر بھی ہے۔ رسالے کے شروع ہی میں آپ فرماتے ہیں:۔

"جب میں نے اس زمانے میں لوگوں کے اعتقاد میں اصل نبوت کے متعلق فتور دیکھا پھر ایک شخص معین(اکبر)کی نبوت کے ثبوت تحقق میں(زور)اور نبوت کے شروع کردہ امور میں (فتور دیکھا) اور لوگوں میں اس کا شایع ہونا متحقق ہوگیا یہاں تک کہ شرایع کی پیروی اور رسولوں پر یقین کی پختگی کی وجہ سے ہمارے زمانے کے بعض جابروں نے بہت سے علماء کو مختلف سختیاں اور ایذائیں پہنچائیں جن کا ذکر مناسب نہیں بہت سے علماء اسلام قتل کردیے گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس مجلس میں خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام کی تصریح ترک کردی گئی اور جس کا یہ اسم شریف تھا اسے بدل کر دوسرا نام رکھا گیا۔ -----

---

(۱)۔ ملاحظہ فرمایئے، "باقیات باقی"۔ از حضرت ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب مدظلہ العالی حیدرآباد ۱۹۹۰ء۔ (۲)۔ ردروافض۔ اردو ترجمہ از حضرت ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب مدظلہ العالی(۱۹۶۵ء)

گائے کا ذبح کرنا ممنوع قرار دیا گیا' حالانکہ یہ ہندوستان میں بڑے شعائر اسلام میں سے ہے۔ مساجد اور مسلمانوں کے مقابر ویران کردیے گئے۔ کفار کی عبادت گاہوں اور ان کے رسوم و عبادات کے دنوں کی تعظیم کی گئی۔ مختصر یہ کہ اسلام کے شعائر اور اس کی علامتیں باطل قراز دی گئیں اور کفار کے رسوم اوران کے ادیان باطلہ رائج کیے گئے' حتیٰ کہ کفار ہند کے احکام ظاہر کیے گئے اورانھیں ان کی زبان سے فارسی میں منتقل کیا گیا تاکہ اسلام کے سارے آثار مٹادیں۔ میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ شک اور انکار کا دائرہ پھیلتا جارہا ہے۔ خودالطباء(یعنی علمائے سوء)بیمار ہوچلے ہیں اوراللہ کی مخلوق ہلاکت تک پہنچ گئی ہے۔ میں نے ایک ایک کے عقائد کو ٹٹولا اوران سے ان کے شبہات دریافت کیے' ان کے دلی خیالات اوراعتقادات کی جانچ پڑتال کی' تو میں اس نتیجہ پر پہنچاکہ اس ساری خرابی کی وجہ یہ ہے کہ یہ زمانہ حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے دور جاپڑا ہےاور حکمائے ہند اور فلسفہ کی کتابوں سے شغف بڑھ گیا ہے۔ میں نے ایسے افراد سے مناظرہ بھی کیا جنھوں نے فلسفہ اور کافروں کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اورجن کو فضل کی فضیلت کا دعویٰ بھی ہے(یعنی ابوالفضل)ان لوگوں نے خلق خدا کو گمراہ کیا ہے اور تحقق اصل نبوت اور شخص معین(اکبر)کے لیے اس کے ثبوت کے سلسلے میں خود بھی بھٹکے ہیں اور دوسروں کو بھی بھٹکایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حکمت و مصلحت اور مخلوق کی ظاہری حالت کو سنوارنااوران کو لڑائی جھگڑے اور خواہشات نفسانی کے انہماک سے روکنا ہی حاصل نبوت ہے۔۔۔۔۔"

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالے کے اس اقتباس سے حسب ذیل باتیں واضح ہیں:۔

۱۔ اصلی نبوت پر شک و شبہہ پیدا کر کے اکبر کی نبوت ۔کے لیے کوشش کی گئی۔

۲۔ شرائع کی پیروی کرنے والوں اور رسولوں پر یقین رکھنے والوں کو سخت ایذائیں دی گئیں اور بہت سے علماء کو قتل کیا گیا۔

۳۔ اکبر کی مجلس میں حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پاک کی تصریح ترک کردی گئی(اہل قلم لوگ اپنی کتابوں سے نعت کو خارج کرنے لگے)

۴۔ جس شخص کا نام حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر رکھا گیا تھا وہ بدل دیا گیا۔

۵۔ گائے کا ذبح کرنا قانوناً" ممنوع قرار دیا گیا۔

۶۔ مسجدوں کو منہدم اور ویران کیا گیا۔

۷۔ مقبروں کو توڑا گیا۔

۸۔ کافروں کی عبادت گاہوں اور ان کی عبادت کے طریقوں کی تعظیم کی گئی (ان کے تہواروں کی تعظیم کی گئی)

۹۔ کفار کی دینی کتابوں کو فارسی میں منتقل کیا گیا تاکہ اسلام کے آثار مٹادیے جائیں۔

۱۰۔ لوگوں کے عقائد کی جانچ پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ حکمائے ہند اور کتب فلسفہ کی طرف شغف بڑھ گیا ہے اور دین اسلام کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔

۱۱۔ ابوالفضل سے حضرت مجددؒ نے مناظرہ بھی کیا کیوں کہ وہ اکبر کو نبوت کے درجے پر فائز کر رہا تھا۔

۱۲۔ ابوالفضل کا خیال تھا کہ حکمت و مصلحت اور مخلوق کی ظاہری حالت کو سنوارنا' نیز ان کے لڑائی جھگڑے ختم کرانا اور خواہشات نفسانی کے انہماک کو روکنا حاصل نبوت ہے۔یعنی اکبر یہ تمام کام کر رہا ہے اس لیے نبوت کا اہل اسی کو قرار دینا چاہیے۔

حضرت [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ [illegible]

[illegible] حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

> [illegible] فصاحت و بلاغت [illegible] اور [illegible]
> [illegible] انہوں نے اپنے [illegible]
> [illegible]
> اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے [illegible]
> [illegible]

حضرت [illegible] ہے
واضح ہوتا ہے کہ [illegible] ان کے متعلق
[illegible]

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے [illegible]
فرماتے ہیں [illegible]

> ... [illegible] ایک [illegible] سے [illegible]
> [illegible]
> [illegible]
> [illegible]

اسلامی شعائر کو ظاہر کرتا ہے تو قتل کرادیا جاتا ہے۔"

اسی طرح دوسرے مکتوبات میں بھی اسلام کی غربت کا ذکر آتا ہے اور عوام کی بے راہ روی کی تفصیل بھی آتی ہے۔ اکبری دور کے حالات کا ذکر دفتر اول کے مکتوب ۴۷ میں بھی ہے۔ شیخ فرید بخاری کو لکھتے ہیں:۔

"پچھلے دور میں (یعنی اکبری دور میں) اہل کفر برملا اسلامی علاقوں میں کفر کے احکام جاری کرتے تھے۔ اور مسلمان اسلام کے احکام کے اظہار سے عاجز تھے۔ اگر اظہار کرتے تو قتل کردیے جاتے تھے۔۔۔"

اسی میں مکتوب الیہ کو اسلام کے جاری کرنے پر زور دیتے ہیں۔ پھر میر صدر جہاں کو (دفتر اول مکتوب ۱۹۵) لکھتے ہیں:۔

"اب جبکہ حکومت پلٹ گئی اور اہل ملل کے عناد کا زور ٹوٹ گیا ہے تو تمام مقتدایان اسلام پر چاہے وہ وزرائے عظام ہوں یا علمائے کرام یہ لازم آتا ہے کہ اپنی تمام کوشش شریعت کی ترویج پر لگادیں اور اسلام کے منہدم ارکان کو قائم کریں۔ تغافل میں کوئی فائدہ نہیں۔ مسلمانوں کے دل ملول ہیں۔ ان کو پچھلے دور کے مصائب یاد ہیں۔ کہیں یہ نہ ہو کہ تلافی مافات کی صورت ہاتھ سے نکل جائے اور اسلام کی غربت میں مزید اضافہ ہو۔ بادشاہوں کو طریقہ نبویہ کی اشاعت کا خیال نہ ہو اور بادشاہ کے مقربین اپنے کو اس کام سے دور رکھیں اور چند روزہ حیات کی فکر میں اہل اسلام کا معاملہ کیوں کر خراب نہ ہو۔"

دیکھیے کس طرح سے حضرت مجددؒ نے ارکان سلطنت کو خبردار کیا ہے اور کافرانہ مشرکانہ اور ہندوانہ طور طریقوں اور برائیوں کے خلاف جہاد کیا ہے۔ حزب الشیطان کے خلاف حزب اللہ کی یہ جنگ بہت سی فتوحات کا پیش خیمہ بنی۔ بہ تغیر جو دین سے بے

نیاز تھا دین کی بات سننے اوراس پر عمل کرنے کے لیے آمادہ ہوگیا۔ شاہ جہاں اور اورنگ زیب دین کے خادم بنے۔ جہانگیرہی کے زمانے سے سجدہ تعظیمی موقوف ہوا۔ گائے کا ذبیحہ پھر شروع ہوا۔ جو مسجدیں منہدم کرادی گئی تھیں وہ دوبارہ تعمیر ہوئیں۔ خلاف شرع قوانین بھی منسوخ کیے گئے۔ فن مصوری جو عہد جہانگیر میں بام عروج کو پہنچا ہوا تھا وہ فن تعمیراور فن خطاطی کی طرف منتقل ہوا۔ اورنگزیب کے زمانے میں فقہ کی سب سے بڑی کتاب "فتاویٰ عالمگیری" مرتب ہوئی۔ دربار میں علماء اور فضلاء کو جگہ ملی۔ پھر حضرت مجددؒ کے سلسلے میں شاہ ولی اللہؒ میرزا مظہرجان جاناںؒ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ خالد رومی صاحب فتاویٰ شامی' اور شاہ عبدالغنی مجددیؒ جیسے اکابر کی وجہ سے دین کی شمع آج بھی روشن ہے اور انشاء اللہ ان بزرگوں کے فیوض و برکات قیامت تک جاری و ساری رہیں گے۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

"فرمایا حضرت صاحب مدظلہ نے"

جھوٹ بولنا اور جھوٹا عمل پیش کرنا ایک مہذب قوم کا شیوہ نہیں ہوسکتا۔

فرض شناسی یہ ہے کہ جو چیز لازمی اور ضروری ہو اس کو پہچاننا اور اس کو اختیار کرنا۔

ہماری تاریخ کے اہم موڑ

احیائے دین کی تحریک

(آہنگ - ریڈیو پاکستان)

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ میں ایسی ہستیاں بکثرت گزری ہیں جو عہد آفریں تھیں اور جنھوں نے زمانے کے دھارے کا رخ موڑ دیا ہے۔

سب سے پہلے محمد بن قاسم تھے جو اٹھارہ سال کی عمر میں برصغیر پر حملہ آور ہوئے۔ اسباب کچھ بھی ہوں لیکن ان کے نتائج اور عواقب یہ ہوئے کہ وہ سندھ جو وحشیانہ اور غیر متمدن خصائل کا آماجگاہ تھا شائستہ اور مہذب شہریت کا حامل بن گیا۔ عربی علوم و فنون، تاریخ، منطق، فلسفہ اور جغرافیہ وغیرہ کے بکثرت علماء اور فضلاء کا ذکر ابن حوقل اور مقدسی کی کتابوں میں ملتا ہے۔

ابن خردادبہ اور اصطخری نے یہاں کی مہذب اور متمدن زندگی کی تفصیل بیان کی ہے جو اسلام سے متاثر تھی اور ان اثرات و برکات کا نتیجہ تھی جن سے محمد بن قاسم اپنے وطن طائف میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہؓ اور تابعینؒ سے مستفیض ہوئے تھے۔

ان کے بعد غزنوی سلاطین کا زمانہ آتا ہے، جب کہ محمود غزنوی جو حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی رحمتہ اللہ علیہ کا تربیت یافتہ تھا، ہندوستان پر حملہ آور ہوتا ہے، اس کی شجاعت اور سپہ سالاری کے کارنامے اپنی جگہ تھے لیکن اس کے حسن انتظام اور رواداری کے واقعات سے وہ فرنگی مورخین بھی دنگ رہ جاتے ہیں جو مسلمانوں کی عیب جوئی کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔ ELPHINSTONE اور KEENE دونوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ محمود اور اس کے جانشینوں نے اپنے مذہبی جوش کے باوجود

کسی شخص کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا اور نہ جنگ کے علاوہ کسی کو قتل کیا۔ محمود کی عہد آفرینی سے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ موجودہ علوم و فنون بالخصوص معاشیات، عمرانیات، طب و جراحت اور فارسی ادب کی تاسیس سب کی سب اس کی مرہون منت ہے۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے شیخ ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ پایا ہے، اور ان سے استفادہ بھی کیا ہے، اسی زمانے میں تھے اور آج بھی وہ برصغیر کے سب سے پہلے صوفی قرار دیے جاتے ہیں۔

پھر غوری اور شمسی سلاطین کا زمانہ آتا ہے، اور وہ اکثر و بیشتر شریعت پر کاربند تھے لیکن اسی زمانے میں یعنی چھٹی صدی ہجری میں سب سے نمایاں ہستی سلطان الہند خواجہ غریب نواز اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے جنھوں نے اپنے زمانے کی تاریخ کو یکسر بدل دیا۔ اور اپنے اخلاق و کردار سے برصغیر میں ایسے اثرات چھوڑے ہیں جو شاید رہتی دنیا تک قائم رہیں گے۔ محبت، اخوت، رواداری، تواضع، خیر خواہی وغیرہ بے شمار کمالات کا فروغ اور ابلاغ حضرت خواجہ صاحبؒ کا کارنامہ ہے جو انکی عہد آفرینی اور تاریخ سازی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ پھر انکے متبعین نے ملک کے طول و عرض میں ایسے اثرات چھوڑے ہیں کہ جن کی بدولت ہر مذہب و ملت کے لوگ باہمی خلوص اور محبت کے پاکیزہ اوصاف کو اپنائے ہوئے ہیں۔

شمسی، خلجی، تغلق اور لودھی خاندان کے بعد مغلوں کا زمانہ آتا ہے۔ چوتھی صدی ہجری تک تمام عالم اسلام کی مملکتوں میں عربی رائج تھی۔ (محمود غزنوی کے زمانے میں فارسی کو فروغ ہوا۔ بابر کے زمانے میں ترکی رائج تھی) چنانچہ ان تمام زبانوں میں تصوف کی کتابیں بھی لکھی جانے لگیں۔ امیر تیمور حضرت خواجہ بہاء الدین نقش بند بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے پیر بھائی تھے۔ بابر بھی اسی سلسلے میں منسلک تھے۔ بلکہ ہمایوں کی بیماری کا سلب کرنا بھی اسی روحانی قوت کا مظہر تھا۔ لیکن بعد میں تصوف فلسفہ بن گیا

اور منطق و فلسفے پر اتنا زیادہ زور دیا جانے لگا کہ علم کلام کی باریکیاں اور فقہی موشگافیاں ہی دل چسپی کا سامان بن گئیں۔

آخری نویں صدی ہجری میں رد عمل کے طور پر سید محمد جونپوری کی تحریک مہدویت شروع ہوئی جس کا مقصد علماء کی ظاہر پرستی اور عوام کی بدعت پسندی کا انکار تھا، لیکن اس تحریک سے فائدہ کم ہوا اور نقصان یہ ہوا کہ انھوں نے خود کو مہدی آخرالزماں کہلوایا۔ چنانچہ علماء نے ان کی مخالفت کی اور انھیں مجبوراً فراہ کی طرف فرار ہونا پڑا۔

سندھ میں اس تحریک کا اثر ضرور ہوا۔ لیکن یہاں ایسے فقہاء اور علماء موجود تھے جن کے آگے اس تحریک کا چراغ نہ جل سکا۔ میر علی شیر قانع تتوی کی تحفۃ الکرام (جلد سوم) میں سندھ اور ملتان کے سیکڑوں بزرگوں کا موضوع وار تذکرہ ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کا غلبہ کس قدر قائم ہو چکا تھا۔ لیکن وقت گزرنے سے یہ جذبہ کم ہونے لگا۔

ادھر دور اکبری کے فتنے شروع ہونے لگے۔ اکبر کے حرم میں ہندو رانیاں تھیں ان کے اثر سے ہندوانہ رسم و رواج، مشرکانہ عقائد کو فروغ ہوا۔ عبدالقادر بدایونی نے کھلم کھلا اور ابوالفضل نے پردہ داری کے ساتھ ان تمام عقائد اور رواج کا ذکر کیا ہے۔ داڑھیوں کا صفایا باقاعدہ جشن کے ساتھ کیا جانے لگا۔ شراب نوشی جائز کی گئی۔ تخت کے گرد کتے اور سور قیمتی جھولیں پہنا کر بٹھائے جانے لگے۔ سرکاری مدارس میں عربی موقوف اور علوم عقلی رائج کرنے کا حکم ہوا۔ شمسی سال اور زرتشتی عیدیں رائج کی گئیں۔ سلام کے بجائے "اللہ اکبر" اور جواب میں "جل جلالہ" کی رسم جاری ہوئی۔ ملا شیری سیالکوٹی نے بھی کہا ہے کہ "بادشاہ امسال دعوائے نبوت کردہ است گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن۔"

اس زمانے میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ان فتنوں کے خلاف تن تنہا کھڑے ہو گئے۔ اور قید و بند کی تکلیفوں کو برداشت کرتے ہوئے شریعت کے نفاذ کے لیے کوشاں رہے۔

برصغیر کی دینی تاریخ کا سب سے اہم انقلاب غالباً انہی کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوا۔ ان کی قربانیوں سے سجدہ تعظیمی موقوف ہوا۔ گئے کا ذبیحہ پھر رائج ہوا۔ کافرانہ رسمیں جو دربار میں یا باہر رائج تھیں ختم کی گئیں، جو مسجدیں منہدم کروادی گئی تھیں وہ دوبارہ تعمیر ہوئیں۔ خلاف شرع قوانین منسوخ ہوئے۔ پھر حضرت مجددؒ اور ان کے تلامذہ کی وجہ سے دربار میں علما اور فضلا کو جگہ ملی۔ شاہ جہاں اور اورنگ زیب آپ ہی کے خاندان کے تربیت یافتہ تھے اور اورنگزیب کے عہد میں فتاویٰ عالمگیری آپ ہی کے تربیت یافتگان کے خاندان والوں نے لکھی۔ آپ ہی کے شاگردان سلسلہ میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت مظہر جان جاناںؒ، شاہ غلام علیؒ، قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ، مولانا خالد رومیؒ صاحب فتاویٰ شامی، شاہ عبدالغنی مجددیؒ جن کے شاگرد بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا مظہر سہارنپوری تھے۔ اور علماء دیوبند و بریلی وغیرہ پیدا ہوئے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے بعد ان کے سلسلے کے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی اصلاحی تحریک بھی بہت اہم ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو تقلیدی روایات اور بدعات سے روک کر کتاب اور سنت پر چلانے کی کوشش کی۔ ادھر مرہٹوں کی قوت کو توڑنے کے لیے شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ اور اس کو خطوط لکھے۔ اگر احمد شاہ ابدالی اپنی فتح و نصرت کے بعد ہندوستان میں اپنے قدم جمالیتا تو شاہ صاحب کی تحریک کو بڑی تقویت حاصل ہوتی۔ لیکن اس کے چلے جانے سے اس کے متبعین میں بھی قوت نہ رہی۔ البتہ شاہ صاحب کے متبعین اپنا

کام کرتے رہے۔ شاہ صاحب کے صاحبزادوں کے علاوہ ان کے پوتے شاہ اسمٰعیل دہلوی نے اپنے پیر سید احمد بریلوی کے ساتھ مل کر دین کی تاریخ میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

پنجاب کے مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم کے واقعات عرصے سے سنے جارہے تھے۔ سید احمد صاحب اور شاہ اسمٰعیل نے سکھوں اور انگریزوں کے خلاف پورے ملک کے گوشے گوشے میں تحریک چلائی اور ہر جگہ اپنے مرکز قائم کئے۔ ٹونک، دہلی، کرنال، تھانیسر، لیرکوٹلہ، بھاولپور، خیرپور میرس (جہاں موجودہ پیرپگاڑا صاحب کے جد امجد تھے) وغیرہ سے خاصی امداد حاصل کی۔

سکھوں سے مقابلہ اور مقاتلہ جاری رہا۔ آخر بڑھتے بڑھتے بالاکوٹ میں ان کو سخت ہزیمت ہوئی۔ اور وہیں دونوں بزرگ شہید ہوئے۔ گویا اس طرح مسلمانوں کی ایک عہد آفریں تحریک کا خاتمہ ہوا۔ لیکن اس تحریک نے پورے ملک میں جوش اور ولولہ پیدا کردیا تھا۔ اور یہ آگ سلگتے سلگتے شیخ الہند محمود حسنؒ کے زمانے میں پھر بھڑک اٹھی۔

احیاے دین کے لیے علماء کی ان خدمات کے علاوہ سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو کی خدمات بھی یادگار ہیں۔ سراج الدولہ کے ساتھ میر جعفر نے کیا کیا، اور ٹیپو کے خلاف میر صادق نے کیا سازش کی۔ تاریخ کے صفحات محو نہیں کرسکتے۔ علامہ اقبالؒ کا یہ شعر ان کے کردار کی صحیح تصویر ہے۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن

ننگ ملت، ننگ دیں، ننگ وطن

شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ حیدر علی اور ٹیپو کی حیثیتیں محض دینی جذبے کی وجہ سے تھیں۔ ان کا عَلَم جو اب بھی انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے، اس کی

نقشبندی بزرگوں کے نام کندہ ہیں۔ اور حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی کندہ ہے۔ وہ ان بزرگوں کے ناموں کی برکت پر یقین رکھتے تھے۔ لیکن سراج الدولہ کی طرح ٹیپو کے ساتھ بھی دھوکا ہوا اور وہ بھی سازش کا شکار ہوا۔

صاحبان تخت و تاج میں بہادر شاہ ظفر بھی شامل ہیں۔ ان کی کوئی جنگ، احیائے دین کی خاطر نہ سہی لیکن جرم دین کی وجہ سے وہ معتوب ضرور ہوئے۔ اور انھیں یقین تھا کہ ہندوستان کی فوج سے اب توقع رکھنا فضول ہے۔ وہ کہتے ہیں:

سے

اعتبار صبر و طاقت، خاک میں رکھوں ظفر

فوج ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا

بہر حال بہادر شاہ ظفر کے بعد احیائے دین کے لیے ایک آخری جنگ شیخ الہند محمود حسن نے ضرور کی ہے۔ ہوا یہ کہ یورپ کی بڑی طاقتوں کی شہ پاکر بلقان کی ریاستوں نے (اکتوبر ۱۹۱۳ء میں) ترکوں پر حملہ کر دیا تاکہ ان سے مقدونیہ چھین لیا جائے۔ انھوں نے آخر ADRIAROPOL بھی لے لیا۔ اور دوسرے علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا۔

پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کے بہت سے مقبوضات سے محرومی ہوئی۔ یہاں تک کہ حجاز بھی ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔

یہ تمام واقعات ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بہت روح فرسا تھے۔ انھوں نے اپنے طور پر انگریزوں کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا شبلی، مولانا ظفر علی خاں، علامہ اقبال، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی وغیرہ نے دامے، درمے، سخنے انگریزوں کی مخالفت میں اپنے ترک بھائیوں کی حمایت کی۔ چندے کیے، وفود بھیجے، طبی امداد کی، اور شیخ الہند محمود حسن نے خاموشی سے انگریزوں کے خلاف اپنے شاگردوں کے ذریعے روس، افغانستان اور ترکی کو اپنے پیامات بھیجے۔ لیکن خود ان کے حلقہ ارادت میں ایسے لوگ بھی تھے جو چند ٹکوں کی خاطر انگریزوں کی

طرف سے جاسوسی کرنے لگے۔ شیخ الہند اور ان کے چند رفقاء مالٹا میں قید کردیئے گئے۔ اس دور کی سیاست کی تاریخ بہت طویل ہے۔ مختصر یہ ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں نے انگریز کے کردار کو خوب پرکھ لیا تھا اور انھیں یقین ہوگیا تھا کہ اس قوم کی عیاری کی وجہ سے مسلمانوں کو ان کے حقوق کبھی حاصل نہ ہوسکیں گے اور برادران وطن ہمیشہ دغا کریں گے۔ اس لیے تاریخ کا ایک اہم موڑ اس طرح ظہور پذیر ہوا کہ قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان اور ایک علیٰحدہ مملکت کا مطالبہ کرکے ۱۹۴۷ء میں اسے قائم بھی کردیا۔ لیکن ان کا مقصد صرف اسلامی حکومت کا قیام تھا۔۔۔ خدا کرے کہ ہم اپنی تاریخ کے اصل مقصد اور اصل غرض و غایت تک پہنچ سکیں، اور اس خوں چکاں داستان کی تکمیل و تتمیم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔۔۔۔ علامہ اقبال نے اس داستان کے متعلق خوب فرمایا ہے۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

ہماری انفرادی قربانی سے لیکر اجتماعی قربانی تک کی داستان دنیا کی تاریخ کو ازبر ہے۔ کاش ہم اس کی حقیقت تک پہنچ سکیں۔ اللہ کی رحمت سے کچھ بعید نہیں۔

تحریک اسلامی اور شاہ ولی اللہؒ

(آہنگ - ریڈیو پاکستان - ستمبر ۱۹۸۸ء)

شاہ ولی اللہ دھلوی کی انقلابی تحریک بکثرت فیوض و برکات کی حامل ہے۔ خود ان کی زندگی کے حالات اور واقعات موجودہ دور کے لیے بہت سبق آموز ہیں۔ وہ اپنے حالات خود ہی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :-

"عمر کے پانچویں سال میرے والد نے مجھے مکتب میں بٹھا دیا اور ساتویں سال نماز پڑھوائی اور روزہ رکھوایا۔ یاد پڑتا ہے کہ اسی سال میں نے قرآن ختم کیا اور فارسی کی کتابیں پڑھنے لگا۔ دسویں سال شرح ملا شروع کی اور کسی قدر مطالعہ سے مطالب حاصل کرنا آگیا۔ چودھویں سال شادی کی۔ پندرھویں سال والد صاحب سے بیعت کرکے اشغال صوفیاء (بالخصوص اشغال نقشبندی) میں مشغول ہوا۔ اسی سال دستار بندی ہوئی اور تمام فنون رسمیہ سے فراغت ہوگئی۔ سترھویں سال حضرت والد فوت ہوگئے اور فقیر کو بیعت کرنے کی اجازت دے گئے۔ اس کے بعد کم و بیش بارہ سال کتب دینیہ و عقلیہ کے درس و تدریس میں مشغول رہا۔ کتب مذاہب اربعہ اور ان کے اصول فقہ اور ان احادیث میں جن سے وہ تمسک کرتے ہیں غور و نظر کرنے کے بعد مدد غیبی سے فقیر نے فقہائے محدثین کی روش اختیار کی۔"

۱۱۴۳ھ میں شاہ صاحب نے اپنے حج کے واقعات کا ذکر کیا ہے اور شیخ ابوطاہر مدنیؒ سے دوبارہ کتب احادیث کی تجدید کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے حالات ہیں۔

غرض کہ شاہ صاحب نے ۶۳ سال کی عمر میں ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ کو دہلی میں وفات

پائی۔ اس مدت میں آپ نے سو بڑی بڑی کتابیں اور سیکڑوں چھوٹے رسالے لکھے۔ عربی اور فارسی میں آپ نے اشعار بھی بہت سے لکھے لیکن آپ کی سب سے مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ ہے جس میں شریعت کے اسرار کو بہت صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے اور یہ ایسے اسرار ہیں کہ شاہ صاحب سے پہلے کسی اور بزرگ نے اس طرح ان کو پیش نہیں کیا ہے۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اہمیت اور افادیت کو واضح کرکے فطرت سلیمہ کو دعوت دی ہے اور احکام اور شرائع کے حقائق و اسرار اس خوبی سے بیان کیے ہیں کہ ایک عام آدمی بھی مستفیض ہو سکتا ہے۔

شاہ صاحب نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ عجیب و غریب مصائب سے پر ہوچکا تھا۔ ملک میں طوائف الملوکی ' سیاسی ابتری' اخلاقی پستی' دینی کمزوری اور علمی پستی پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ صاحب نے قرآن و حدیث کی تعلیم و تدریس پر زور دیا اور مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ یونانی فلسفہ جو ابوالفضل کے زمانے سے ہمارے ملک میں عام ہو کر دین کو پس پشت ڈالے ہوئے تھا' اس کے دفعیہ کے لیے شاہ صاحب نے "حجۃ اللہ البالغہ" ہی کے ذریعے قرآن و حدیث کے اسرار کو عام کرنا چاہا۔ لوگوں کی دینی حسیت کو بیدار کیا۔ اخلاقی پستی کو دور کیا۔ بدعات کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی۔ نظام تعلیم کو نئے انداز سے مرتب کیا۔ علمی جمود اور سیاسی تعطل کے دور کرنے کے لیے تحریری اور تقریری دونوں طرح کی کاوشیں کیں۔ معاشرے کے ہر طبقے اور ہر گروہ سے مخاطب ہو کر اسکی خامیوں سے مطلع کیااوراس کے انجام سے ڈرا کر صحیح راستہ دکھلایا۔ ان کے عیوب کو گنا گنا کران کا علاج تجویز کیا' اوراپنی کتاب تفہیمات کے ذریعہ تمام مصائب اور متوقع مصائب سے آگاہ کیا۔ آپ نے متعصب فرقہ پرستوں اور مختلف مکتب خیال کے لوگوں کو ایک مرکز پر لانے کی کوشش کی۔ افراط و تفریط کو دور

کیا۔ امت کی سالمیت اور اس کے اتحاد کو برقرار رکھنے میں آپ کی مساعی جلیلہ یادگار ہیں۔ عجمی تصوف، معقولین کے اثرات مغربی خیالات جو اس وقت شروع ہو رہے تھے، شکوک و شبہات کا رجحان جو دین کو چھوڑنے سے پیدا ہوتا ہے اور دوسرے عیوب شاہ صاحب کی کوشش سے سرد پڑ گئے اور ایک بار پھر شعائر اسلامی کی حرمت مسلمانوں کے دلوں میں بیدار ہوئی۔ شاہ صاحب ایک موقع پر اللہ پاک کے ایک انعام کا اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ:۔

> "اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ قدرت دی ہے کہ امر حق کو دلائل عقلیہ و نقلیہ سے اس طرح ثابت کر دوں کہ اس میں کسی قسم کا اشکال اور شبہہ باقی نہ رہے۔"

درحقیقت شاہ صاحب کو ایسی ہی قدرت حاصل تھی اور یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

"فرمایا حضرت صاحبؒ نے"

فرائض اور واجبات، سنن، مستحبات سب میں خلوص ہو اور ہر ہر قدم پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کی کوشش فرمائیں۔ یہی منزل مقصود ہے ورنہ راہب اور جوگی بھی کسی نہ کسی طرح عبادات اور ریاضت کر لیتے ہیں۔

دوسرے مذاہب

(غیر مطبوعہ مضامین)

بوہرے

لفظ بوہرہ، بوہار (بیوپار) سے مشتق ہے یا یمن کے قبیلہ ہمدان سے متعلق ہے۔ کہا جاتا ہے
کہ بوہرہ حضرات خود کو یمنی بھی کہتے ہیں۔ اس جماعت کے پہلے مبلغ عبداللہ یمنی تھے
یا سیدی احمد تھے جو مصر کے خلیفہ مستنصر کے ایماء پر ۴۵۹ھ بمطابق ۱۰۶۷ء میں کھمبات
آئے تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ ان کے پہلے مبلغ ملا علی (بن پرواز یا بن ...) تھے
جو ۵۳۲ھ بمطابق ۱۱۳۷ء میں کھمبات میں فوت ہوئے۔(۱)

وہ ہندوانہ طریقوں پر عامل ہوتے ہیں۔ وراثت کے معاملے میں شرع کے پابند نہیں۔
علانیہ طور پر سود لیتے اور دیتے ہیں۔ دیوالی کے موقع پر ہندوؤں کی طرح اپنے حساب کی
کتابیں بدلتے ہیں لیکن زکوٰۃ باقاعدہ دیتے ہیں، عموماً داڑھی رکھتے ہیں، ہندوؤں کے
ہاتھ کی مٹھائی نہیں کھاتے، ہندو دھوبی سے کپڑے نہیں دھلواتے اور مسکرات سے
پرہیز کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ سنی ہو گئے ہیں جو شریعت کے زیادہ پابند ہیں۔
موجودہ دور میں اصلاح پسند بوہرے بھی ہیں جو ملا طاہر سیف الدین مرحوم کے متعلق
کہتے ہیں کہ انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ:

۱۔ میں زمین کا خدا ہوں۔(۲)

۲۔ میں نبیؐ کا عہدہ تو نہیں رکھتا مگر ان کے مثل قدرت اختیار رکھتا ہوں۔(۳)

۳۔ میں بوہروں کی جان و مال کا مالک ہوں۔(۴)

۴۔ میں کامل معصوم ہوں اور میں خطا نہیں کرتا۔(۵)

---

(۱)۔ آب کوثر۔ صفحہ ۳۰۰ (۱۹۵۲ء)۔ (۲)۔ ملا یونس شکیب مبارکپوری۔ "بوہرے ملاؤں کا ..." (دہلی ۱۹۸۷ء) صفحہ ۲۶۔ (۳)۔ ایضاً۔ صفحہ ۲۷۔ (۴)۔ ایضاً۔ صفحہ ۲۹۔ (۵)۔ ایضاً۔ صفحہ ۳۰

۵۔ کلمہ اخلاص (کلمہ طیبہ) سنیوں سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ کیوں کہ انھوں نے صرف رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کا اقرار کیا ہے اور وصیؔ کے مرتبے کا انکار کیا ہے جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد حدود میں پہلا مرتبہ ہے۔(۱)

لیکن بہت سے بوہرے بلکہ خوجے بھی سنی ہو گئے ہیں' بلکہ سنی بوہرے مذکورہ بالا عقائد کے ہمیشہ سے منکر رہے ہیں۔

ذکری مذہب

مکران اور بلوچستان کے بلوچ باشندے اس بات پر متفق ہیں کہ ذکری مذہب کا بانی ملا محمد اٹکی ہے جس کا ظہور (۹۷۷ھ / ۱۵۶۹ء میں ہوا اور ۱۰۲۹ھ / ۱۶۱۹ء میں وہ روپوش ہو گیا)۔ اس فرقے کی تبلیغ سے بلوچ اور براہیوں کے بعض قبائل ذکری ہو گئے اور مکران میں خصوصیت سے ان کے لوگ پائے جاتے ہیں۔(۲) یہ لوگ ملا محمد اٹکی کو مہدی سمجھتے ہیں اور یہ کہتے۔

"مہدی ایک ایسا نور ہے جس کا نہ باپ ہے نہ ماں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو دنیا میں بصورت روحانی سیر کرنے کے لیے بھیجا تاکہ وہ دنیا میں آکر اپنے ذکری امتی کو جن کا لقب مومنؔ ہے نصیحت و ہدایت کرے اور ذکریؔ مذہب کی تعلیم دے اور اللہ تعالیٰ نے مہدیؔ سے یہ بھی کہا کہ توریت' انجیل' زبور اور قرآن مجید سے کچھ مسائل انتخاب کر کے لے جائیں اور اپنے ذکری اُمتی کو بتائیں۔ چنانچہ مہدی نے توریت' انجیل اور زبور میں سے چار مسائل نکالے اور قرآن چالیس جزو پر مشتمل تھا جن میں سے دس

---

(۱)۔ ایضاً۔ صفحہ ۸' اسی کتاب کے صفحہ ۴۷ میں ایک تصویر ہے جس میں ملا طاہر سیف الدین کے صاحبزادے محمد برہان الدین کو ایک بوہرہ باقاعدہ سجدہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔(۲)۔ ان کے متعلق تفصیل مولوی عبدالمجید کی کتاب "ذکری مذہب" (کراچی ۱۹۷۹ء) میں ملتی ہے۔

جزو مہدی نے نکالے جو کہ اسرار خداوندی تھے اور قرآن کے مغز تھے ـــــــــ"(۱)

اس فرقے کا خیال ہے کہ:

"اس (مہدی) نے دنیا کی کوئی غذا نہیں کھائی اور کھانا تو درکنار' دنیا کی غذا کی بو' اس کی ناک تک نہیں پہنچی۔ مہدی نے دنیا میں آکر نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ اور دیگر ارکان اسلام کو منسوخ کیا۔ نماز کی جگہ صرف ذکر کا حکم دیا۔ رمضان کے روزوں کی جگہ صرف ذی الحجہ کے ابتدائی دس روزے مقرر کیے۔ حج بیت اللہ کی جگہ حج کو مراد (جو تربت میں ہے) فرض مقرر کیا۔ عبادت کے وقت قبلہ رخ ہونا ضروری نہیں۔ چوگان کھیلنا بہت بڑا ثواب ہے۔ (اس) مہدی نے دنیا میں آکر تمام نیک اور صاحب دل بزرگوں کو فیض پہنچایا اور خود سید محمد جونپوری (م ۹۱۰ھ / ۱۵۰۴ء) نے مہدی سے فیض حاصل کیا۔ اگر مہدی نہ ہوتا تو اس دنیا کو اللہ تعالیٰ پیدا نہ کرتا۔ خدا عاشق' مہدی اس کا معشوق ہے۔ تمام انبیاء سے اللہ تعالیٰ نے مہدی کے بارے میں اقرار لیا تھا کہ اس پر ایمان لاؤ۔"(۲)

---

(۱)۔ ایضاً۔ صفحہ ۱۹-۲۰۔ (۲)۔ ایضاً۔ صفحہ ۲۱۔ اسی جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ پاک نے معراج پر اس لیے بلوایا تھا کہ انھوں نے خود کو خاتم النبیین کیوں کہا جب کہ نبی آخر الزمان نور اولین و آخرین یہ مہدی ہیں جن سے عرش پر ملاقات کرائی گئی تھی۔

اقبالؒ اپنے خطوط کے آئینے میں

(آہنگ - ریڈیو پاکستان - [illegible])

علامہ اقبال کے مکاتیب سے ان کی زندگی کے بہت سے پہلو دریافت ہوتے ہیں۔ آج ہم ان کے ان خیالات اور جذبات کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے مکاتیب میں تصوف سے متعلق مذکور ہیں اور جن کے بارے میں بعض لوگوں میں غلط فہمی بھی پیدا ہوئی ہے۔ ہوا یہ کہ جب علامہ اقبال کی مثنوی اسرار خودی ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی اور اس میں خواجہ حافظؒ جیسے شعراء کی وجہ سے جو نفی حیات کے جذبات قوم میں پیدا ہوتے ہیں ان کی تردید کی گئی تو ملک کے بعض لوگ علامہ کو خواجہ حافظؒ کا مخالف سمجھ بیٹھے اور انھوں نے اخباروں اور رسالوں میں علامہ کے خلاف مضامین لکھنا شروع کیے۔ علامہ نے ۱۴ جون ۱۹۱۸ء کو ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ:

> میں نے خواجہ حافظؒ پر کہیں یہ الزام نہیں لگایا کہ ان کے دیوان سے میکشی بڑھ گئی۔ میرا اعتراض حافظ پر بالکل اور نوعیت کا ہے۔ اسرار خودی میں جو کچھ لکھا گیا وہ ایک ادبی نصب العین کی تنقید تھی جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے عام ہے۔ اپنے وقت میں اس نصب العین سے ضرور فائدہ ہوا ہوگا لیکن اس وقت وہ غیر مفید ہی نہیں بلکہ مضر ہے۔ خواجہ حافظ کی ولایت سے اس تنقید کا کوئی سروکار نہ تھا اور نہ ان کی شخصیت سے، نہ ان اشعار میں مے سے مراد وہ مے ہے جو لوگ ہوٹلوں میں پیتے ہیں بلکہ اس سے وہ حالت سکر مراد ہے جو حافظ کے کلام سے بحیثیت مجموعی پیدا ہوتی ہے۔۔۔ عجمی تصوف سے ادب میں دلفریبی اور حسن پیدا ہوتا ہے مگر ایسا کہ وہ طبائع کو پست کرنے والا

ہے۔ لیکن اسلامی تصوف دل میں قوت پیدا کرتا ہے اور اس قوت کا اثر ادب پر ہوتا ہے۔۔۔"

پھر ۱۷ مئی ۱۹۱۹ء کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"تصوف سے مراد اگر اخلاص فی العمل ہے (اور یہی مفہوم قرون اولیٰ میں لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا، لیکن جب تصوف، فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔"

علامہ اقبال اس قسم کے خیالات کا اظہار ۱۹۰۷ء سے کر رہے تھے جس کا ذکر انھوں نے ۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء کے ایک مکتوب میں کیا ہے اور ۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء کے مکتوب میں انھوں نے ان عجمی اثرات کا ذکر کیا تھا۔ فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے ادبی نظریات بھی ایرانی ہیں اور معاشرتی نصب العین بھی ایرانی ہیں۔۔۔"

علامہ اقبال کا خیال تھا کہ ایسا تصوف جو گوشہ نشینی اور دنیا سے بے تعلقی سکھائے اور صرف اللہ اللہ کرنے پر اکتفا کرے وہ یا تو ایرانی اثرات کی وجہ سے ہے یا پھر بدھ مذہب کی وجہ سے ہے جو ایک زمانے میں پورے پاک و ہند میں پھیلا ہوا تھا۔

۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء کے مکتوب میں وہ لکھتے ہیں:۔

"میرا تو عقیدہ ہے کہ غلو فی الزہد اور مسئلہ وجود مسلمانوں میں زیادہ

تر بدھ مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ خواجہ نقش بند" اور مجدد سرہند"
کی میرے دل میں بڑی عزت ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج یہ سلسلہ بھی
عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے۔
جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں' حالانکہ حضرت محی الدین (عبدالقادر
جیلانیؒ) کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا۔"

علامہ اقبال کا خیال تھا کہ صرف اللہ اللہ کرنا اور ترک دنیا کرنا اسلام کا طریقہ نہیں ہے اور ایسے جذبات صرف قومی زوال اور انحطاط کے باعث پیدا ہوتے ہیں۔ خود ہماری ایسی شاعری بھی اسی قسم کے جذبات اور نفی خودی کی مظہر ہے۔

اجولائی ۱۹۱۶ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل اور شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت لطیف طریق' تنسیخ کا ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصے تک اس کا نشوونما نہ ہونے دیا۔ تاہم وقت پاکر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا۔ یا بالفاظ دیگر' مسلمانوں میں ایک ایسے ادب کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دل فریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔ اگر

اسلام افلاس کو برا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجے کی سعادت قرار دیتا ہے۔ اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لیے ضروری تصور کرتا ہے تو شعرائے عجم اس شعار اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں۔۔۔"

اسی سلسلے میں ایک مکتوب میں وہ یہاں تک لکھتے ہیں کہ:

"تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے۔ جس نے لمعات میں ابن عربی کی فصوص الحکم کی تعلیموں کو نظم کیا۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے فصوص میں سوائے الحاد اور زندقہ کے اور کچھ نہیں۔ اور سب سے آخری شاعر حافظ ہے۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے سیاسی انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہوجائے، جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہوگئی تھی، تو پھر اس قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے، ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہوجاتی ہے اور ترک دنیا موجب تسکین۔ اس کے پردے میں قومیں اپنی سستی، کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع للبقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھیے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ہوا۔۔۔"

مثنوی اسرار خودی کی پہلی اشاعت پر علامہ اقبال پر تنقید ہوئی تھی کہ انھوں نے حافظ جیسے ان شعراء کی مخالفت کی تھی جو:

ع بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نہ خواہی یافت۔۔۔۔۔قسم کی شاعری کرتے تھے۔

اسی زمانے میں یعنی ۱۳ اپریل ۱۹۱۶ء کو وہ ایک مکتوب میں پھر لکھتے ہیں کہ:

"مجھے معلوم تھا کہ اس (مثنوی) کی مخالفت ہوگی۔ کیوں کہ ہم سب انحطاط کے زمانے کی پیداوار ہیں اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے تمام عناصر و اجزاء و اسباب کو اپنے شکار کی نگاہ میں محبوب و مطلوب بنادیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بدنصیب شکار اپنے تباہ و برباد کرنے والے اسباب کو اپنا بہترین مربی تصور کرتا ہے۔"

علامہ اقبال کے متعدد مکاتیب میں قومی زوال کے یہی اسباب بتائے گئے ہیں۔ ایک جگہ ۲۴ جون ۱۹۱۶ء کے مکتوب میں وہ اسلامی تصوف کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:۔

"حقیقی اسلامی تصوف اور چیز ہے۔ تصوف وجودیہ مذہب اسلام سے قطعاً" تعلق نہیں رکھتا اور مذہب ہنود سے گو تعلق رکھتا ہے۔ تاہم ہندوؤں کے لیے بھی سخت مضر ثابت ہوا ہے۔ ہمارے صوفیاء کی کتابوں میں اس امر پر ایک عجیب و غریب بحث موجود ہے کہ گستن اچھا ہے یا پیوستن۔ اور صوفیاء کا اس میں اختلاف ہے۔ اسلامی تصوف کا دارومدار گستن پر ہے اور تصوف وجودیہ کا پیوستن یا فنا پر۔ یعنی خود کو فنا کر دینا اور اسے فنا فی اللہ سمجھنا' تصوف وجودیہ کا طریقہ ہے۔ لیکن اسلام میں ایسی کوئی چیز تعلیم نہیں کی گئی۔ دنیا میں رہنا اور دنیا سے محبت نہ کرنا تو صحیح ہے لیکن دنیا میں خود کو تمام حقوق سے آزاد سمجھنا یعنی حقوق العباد کی پروا نہ کرنا تصوف نہیں ہو سکتا۔ اور نیا' تشوف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول و فعل سے ثابت نہیں ہے۔"

علامہ اقبال ایک مکتوب (مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۶ء) میں بہت ہی پرکیف انداز میں لکھتے ہیں

کہ:۔

"مسلم حنیف، متناقض یعنی قہر و محبت کے جذبات اپنے قلب کی گرمی سے تحلیل کرتا ہے اور اس کا دائرہ اثر اخلاقی تناقضات تک ہی محدود نہیں بلکہ تمام طبعی تناقضات پر بھی حاوی ہے۔ پھر جو مسلم کہ حامل ہے محمدیت کا اور وارث ہے موسویت کا اور ابراہیمیت کا کیوں کر کسی شے میں جذب ہو سکتا ہے۔ البتہ اس زمان و مکان کی متقید دنیا کے مرکز میں ایک ریگستان ہے جو مسلم کو جذب کر سکتا ہے اور اس کی قوت جاذبہ، ذوقی اور فطری نہیں، بلکہ مستعار ہے ایک کفِ پا سے جس نے اس ریگستان کے چمکتے ہوئے ذروں کو کبھی پامال کیا تھا۔"

علامہ اقبال"ضرب کلیم میں بھی لکھتے ہیں:۔

یہ حکمت ملکوتی، یہ علم لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

"فرمایا حضرت صاحب مدظلہ نے"

تصورِ شیخ دراصل توسطِ شیخ ہے کہ مراقبہ میں یہ تصور کیا جائے کہ حضور انور ﷺ کی طرف سے فیض، میرے شیخ کے توسط سے آ رہا ہے۔

اصلاحِ معاشرہ کا اسلامی طریقہ

[illegible]

سوال یہ ہے کہ اصلاح کس طرح ہو اور کس طرح ہو اور اسلام نے اس کے لیے کیا اصول بتائے ہیں۔ یہ اگرچہ باتیں ہیں ان کا ایک جامع طریقہ سورۃ العصر میں بیان فرمایا گیا ہے کہ:

"زمانے کی قسم! بے شک انسان خسارے میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق (بات) کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔"

اس مختصر سی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے زمانہ کی تاریخ کے مطالعہ کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ زمانہ اور زمانے کے حالات کو دیکھا جائے کہ انسان جب اللہ کا رشتہ چھوڑ دیتا ہے تو گھاٹے ہی میں رہتا ہے لیکن اللہ ہی کے رشتے سے اسے اس گھاٹے سے نجات بھی حاصل ہوئی اور فلاح و خیر کے راستے بھی نظر آنے لگتے ہیں۔

اس سورۃ مبارکہ میں دو باتیں فرد کے لیے بتائی ہیں اور دو باتیں جماعت کے لیے فرمائی ہیں۔ وہ فرد جو خسارے سے نجات پانا چاہتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ ایمان لائے اور عمل صالح پر کاربند ہو۔ ایمان کے معنی ہی "امن کر دینا" یا "امن دینا" ہیں۔ یعنی ایمان حاصل کر لینے کے بعد ایک فرد "امن کا ذریعہ" بن جاتا ہے اس لیے ظاہر ہے وہ ہر شخص کے لیے امن ہی کے ذرائع پیدا کرنا چاہے گا جس سے یقیناً" اصلاح معاشرہ میں ہر طرح کی آسانی پیدا ہو سکے گی۔ دوسری چیز جو اس سورۃ میں فرد کے لیے ضروری قرار دی گئی وہ عمل صالح ہے۔ قرآن پاک کی اصطلاح میں عمل صالح صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا دوسرا نام ہے۔ سورۃ ہود (۴۶) میں حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کنعان کے غرق ہو جانے کا واقعہ آیا ہے تو ان سے کہا

فرمایا گیا تھا کہ وہ آپ کے گھر والوں میں سے نہیں تھا کیوں کہ "اس کے تو عمل صالح نہیں ہیں" یعنی اس کے عمل اس وقت صالح کہلاتے جب آپ کی پیروی کرتا۔

غرض کہ سورۃ العصر میں فرد کے لیے ایمان اور عمل صالح ضروری قرار دیے گئے ہیں تاکہ معاشرے میں فساد اور خسارہ نہ ہو۔ پھر اسی سورت میں جو حق اور صبر کی تاکید ہے تو وہ آپس کے معاملات کے لیے ہے یعنی جماعت کے لئے ہے۔ چناں چہ جو جماعت حق اور صبر پر گامزن ہوتی ہے وہ بھی کبھی کسی خسارے میں نہیں پڑتی۔ گویا اس سورۃ میں فرد اور جماعت کے لیے ایک جامع لائحہ عمل بتا دیا گیا ہے۔ اب اگر تفصیل کی طرف جائیں تو معلوم ہوگا کہ ایک فرد کے ایمان کے کیا کیا تقاضے ہیں۔

سورہ بنی اسرائیل (۲۳) میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے فوراً بعد والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم آیا ہے کہ:

"اور تمھارے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا تم کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین سے بھلائی کرو، اگر ان دونوں میں سے ایک یا دونوں تمھارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو "اُف" بھی نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے ادب سے بات کرو اور ان کے سامنے انکساری کا بازو محبت سے جھکاؤ اور ان کے لیے دعا کرتے رہو کہ اے رب ان پر رحم فرما جس طرح بچپن میں انھوں نے میری پرورش کی۔"

پھر فرد کے ایمان کا یہ بھی ایک تقاضا ہے کہ "جب تم کو سلامتی کی دعا دی جائے (یعنی السلام علیکم کہا جائے) تو تم بھی اس سے بہتر سلامتی کی دعا دو (یعنی وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ)" سورۃ النساء (۸۶) ایک اور حکم یہ ہے کہ:

"لوگوں سے عمدہ طریقہ سے بات کرو" سورۃ البقرۃ (۸۳)۔ آواز کو پست رکھنے کا حکم بھی ہے
"اور اپنی آواز دھیمی کرو، گدھوں کی آواز بہت ہی ناگوار ہوتی ہے" (سورۃ لقمان ۱۹)

پھر اصلاح معاشرہ کے لیے یہ بھی فرمایا کہ:۔

"اے ایمان والو تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک بہت ناپسندیدہ ہے کہ تم کہو وہ جو نہیں کرتے ہو۔" (سورہ الصف۔ ۲۔ ۳)

اسی مقصد کے لیے یہ بھی ارشاد ہے کہ "عیب جوئی نہ کرو" (سورۃ الحجرات ۱۱۔ ۳)
یہ بھی فرمایا کہ "باہم برے نام نہ دو ایمان لانے کے بعد بدتہذیبی کا نام بھی برا ہے۔"
یعنی ایک مومن کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ کسی کے ساتھ بدتہذیبی کرے۔ اسی سورہ الحجرات (۱۲) میں یہ بھی ارشاد ہے کہ:۔

"تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ اس کو تو ناپسند کرتے ہو۔"

کسی کا برا نام رکھنا، کسی کی عیب جوئی کرنا، کسی کی غیبت کرنا، گالی دینا، سخت سست کہنا جیسی کتنی ہی برائیاں ہیں جو فتنہ و فساد کے دروازے کھول دیتی ہیں ۔

ایمان والے فرد کے لیے تو چال میں بھی اعتدال رکھنے کا حکم سورہ لقمان ۱۹ میں ہوا۔
"اور اعتدال اختیار کر اپنی چال میں" بلکہ انکساری کے ساتھ چلنے کا حکم ہے کہ

"رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر انکساری سے چلتے ہیں" (الفرقان۔ ۶۳)
"کھانا کھاؤ تو مل کر کھاؤ۔ لیکن علیحدہ بھی کھا سکتے ہیں۔" (سورۃ النور۔ ۶۱) اسی آیت میں ارشاد ہے ۔ "اور اس کا بھی تم پر کچھ گناہ نہیں کہ سب مل کر کھانا کھاؤ یا جدا جدا۔۔۔۔۔"

دیکھیے باہمی محبت اور الفت پیدا کرنے کے کیسے اچھے اچھے طریقے بتائے جا رہے ہیں۔ حق شناسی، نیک عمل، ایثار، اچھی صحبت، سچائی، اللہ پر بھروسا، شکر، عفو و درگزر، تواضع، انکسار، سخاوت، امداد، خیرات، فطرہ، زکوٰۃ، شکر، امانت، کفایت، میانہ روی، توکل

اصلاح معاشرہ کا اسلامی طریقہ

(آہنگ ۔ ریڈیو پاکستان ۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء)

معاشرہ یعنی باہمی میل کیوں ہو اور کس طرح ہو اور اسلام نے اس کے لیے کیا اصول بنائے ہیں۔ یہ ایسی باتیں ہیں جن کا ایک جامع طریقہ سورۃ العصر میں بیان فرمایا گیا ہے کہ۔

"زمانے کی قسم، بے شک انسان خسارے میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق (بات) کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔"

اس مختصر سی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے زمانہ کی تاریخ کے مطالعہ کی طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے کہ زمانہ اور زمانے کے حالات کو دیکھا جائے کہ انسان جب اللہ کا رشتہ چھوڑ دیتا ہے تو گھاٹے ہی میں رہتا ہے لیکن اللہ ہی کے رشتے سے اسے اس گھاٹے سے نجات بھی حاصل ہوتی اور فلاح و خیر کے راستے بھی نظر آنے لگتے ہیں۔

اس سورۃ مبارکہ میں دو باتیں فرد کے لیے بتائی ہیں اور دو باتیں جماعت کے لیے فرمائی ہیں۔ وہ فرد جو خسارے سے نجات پانا چاہتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ ایمان لائے اور عمل صالح پر کاربند ہو۔ ایمان کے معنی ہی "امن کر دینا" یا "امن دینا" ہیں۔ یعنی ایمان حاصل کر لینے کے بعد ایک فرد "امن کا ذریعہ" بن جاتا ہے اس لیے ظاہر ہے وہ ہر شخص کے لیے امن ہی کے ذرائع مہیا کرنا چاہے گا جس سے یقیناً اصلاح معاشرہ میں ہر طرح کی آسانی مہیا ہو سکے گی۔ دوسری چیز جو اس سورۃ میں فرد کے لیے ضروری قرار دی گئی وہ عمل صالح ہے۔ قرآن پاک کی اصطلاح میں عمل صالح صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا دوسرا نام ہے۔ سورۃ ھود(۴۶) میں جہاں نوح علیہ السلام کے بیٹے کنعان کے غرق ہو جانے کا واقعہ آتا ہے تو ان سے یہی

فرمایا گیا تھا کہ وہ آپ کے گھر والوں میں سے نہیں تھا کیوں کہ "اس کے تو عمل صالح نہیں ہیں" یعنی اس کے عمل اس وقت صالح کہلاتے جب آپ کی پیروی کرتا۔

غرض کہ سورۃ العصر میں فرد کے لیے ایمان اور عمل صالح ضروری قرار دیے گئے ہیں تاکہ معاشرے میں فساد اور خسارہ نہ ہو۔ پھر اسی سورت میں جو حق اور صبر کی تاکید ہے تو وہ آپس کے معاملات کے لیے ہے یعنی جماعت کے لیے ہے۔ چناں چہ جو جماعت حق اور صبر پر گامزن ہوتی ہے وہ بھی کبھی کسی خسارے میں نہیں پڑتی۔ گویا اس سورۃ میں فرد اور جماعت کے لیے ایک جامع لائحہ عمل بتا دیا گیا ہے۔ اب اگر تفصیل کی طرف جائیں تو معلوم ہوگا کہ ایک فرد کے ایمان کے کیا کیا تقاضے ہیں۔

سورہ بنی اسرائیل (۲۳) میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے فوراً بعد والدین کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم آیا ہے کہ:

"اور تمھارے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا تم کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین سے بھلائی کرو، اگر ان دونوں میں سے ایک یا دونوں تمھارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو "اُف" بھی نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے ادب سے بات کرو اور ان کے سامنے انکساری کا بازو محبت سے جھکاؤ اور ان کے لیے دعا کرتے رہو کہ اے رب ان پر رحم فرما جس طرح بچپن میں انھوں نے میری پرورش کی۔"

پھر فرد کے ایمان کا یہ بھی ایک تقاضا ہے کہ "جب تم کو سلامتی کی دعا دی جائے (یعنی السلام علیکم کہا جائے) تو تم بھی اس سے بہتر سلامتی کی دعا دو (یعنی وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاۃ)" سورۃ النساء (۸۶) ایک اور حکم یہ ہے کہ:

"لوگوں سے عمدہ طریقہ سے بات کرو" سورۃ البقرۃ (۸۳)۔ آواز کو پست رکھنے کا حکم ہے کہ "اور اپنی آواز دھیمی کرو، گدھوں کی آواز بہت ہی ناگوار ہوتی ہے" (سورۃ لقمان ۱۹)

پھر اصلاح معاشرہ کے لیے یہ بھی فرمایا کہ:۔

"اے ایمان والو تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک بہت ناپسندیدہ ہے کہ تم کہو وہ جو نہیں کرتے ہو۔" (سورہ الصف۔ ۲۔ ۳)

اسی مقصد کے لیے یہ بھی ارشاد ہے کہ "عیب جوئی نہ کرو" (سورۃ الحجرات ۔۱۱۔ ۱۲)

یہ بھی فرمایا کہ "باہم برے نام نہ دو ایمان لانے کے بعد بدتہذیبی کا نام بھی برا ہے۔" یعنی ایک مومن کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ کسی کے ساتھ بدتہذیبی کرے۔ اسی سورہ الحجرات (۱۲) میں یہ بھی ارشاد ہے کہ:۔

"تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے' کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ اس کو تو ناپسند کرتے ہو۔"

کسی کا برا نام رکھنا' کسی کی عیب جوئی کرنا' کسی کی غیبت کرنا' گالی دینا' سخت سست کہنا جیسی کتنی ہی برائیاں ہیں جو فتنہ و فساد کے دروازے کھول دیتی ہیں۔

ایمان والے فرد کے لیے تو چال میں بھی اعتدال رکھنے کا حکم سورۃ لقمان ۱۹ میں ہے:۔

"اور اعتدال اختیار کر اپنی چال میں" بلکہ انکساری کے ساتھ چلنے کا حکم ہے کہ

"رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر انکساری سے چلتے ہیں" (الفرقان۔ ۶۳)

"کھانا کھاؤ تو مل کر کھاؤ۔ لیکن علیٰحدہ بھی کھاسکتے ہیں۔" (سورۃ النور۔۶۱) اسی آیت میں ارشاد ہے ۔ "اور اس کا بھی تم پر کچھ گناہ نہیں کہ سب مل کر کھانا کھاؤ یا جدا جدا۔۔۔۔"

دیکھیے باہمی محبت اور الفت پیدا کرنے کے کیسے اچھے اچھے طریقے بتائے جا رہے ہیں۔ پھر صفائی' نیک عملی' ایثار' اچھی صحبت' سچائی' اللہ پر بھروسا' شکر' عفو و درگذر' تواضع' انکسار' سخاوت' امداد' خیرات' فطرہ' زکوٰۃ' عشر' امانت' کفایت' خود اعتمادی' پیش

بنی، دنیا سے بے رغبتی، صلح کل، تقویٰ، پارسائی، صلہ رحمی، فراخ حوصلگی وغیرہ بکثرت فضائل ہیں جن کو اختیار کرنے کا حکم آیا ہے۔ ظاہر ہے ایک فرد میں یہ خوبیاں پیدا ہوجائیں گی تو کیوں کر معاشرت درست نہ ہوگا۔

جماعت کے لیے بھی اسی طرح کے احکام ہیں جو سورۃ العصر میں مذکور ہیں۔ یعنی حق اور انصاف کے لیے سخت تاکید آئی ہے۔

سورۃ النسآء (۱۳۵) میں اس طرح تاکید ہے کہ۔ "اے ایمان والو خوب قائم رہو انصاف پر۔ گواہ بن کر اللہ کے لیے، اگرچہ وہ خلاف ہو تمھارے اپنے لیے یا والدین کے لیے۔ اگر کوئی دولت مند ہو یا فقیر، تو اللہ کا زیادہ خیرخواہ ہے۔ پس خواہش کی پروا نہ کرو کہ اس طرح تم حق سے پلٹ جاؤ گے ور اگر تم زبان پلٹاؤ گے یا منہ پھیرو گے تو بے شک اللہ خوب واقف ہے اس کام سے جو تم کرتے ہو۔"

جماعت کے لیے حق کا حکم یہ ہے اور صبر کے لیے بھی۔ سورۃ لقمان (۱۷) میں ارشاد ہے:۔

"اور استقلال اختیار کر اس پر جو مصیبت تجھ پر پڑے ۔ بے شک یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔"

اور سورۃ آل عمران (۲۰۰) میں اس طرح ارشاد ہے:۔

"اے ایمان والو۔ کافروں کے مقابلے مین ثابت قدم رہو اور استقامت رکھو اور جمے رہو اور خدا سے ڈرو تاکہ تم کامیاب رہو۔"

نظام تمدن اور حسن معاشرت کے لیے سورۃ الحدید (۲۵) میں یہ بھی ارشاد فرمایا ؟ کہ:۔

"ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل (واضح احکام) کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔ اور ہم نے لوہا پیدا کیا اس

میں سخت طاقت (جنگی طاقت) ہے اور لوگوں کے لیے کئی فائدے ہیں اور اس لیے کہ اللہ جان لے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی بن دیکھے مدد کرتا ہے۔ بے شک اللہ بہت قوتِ والا اور زبردست ہے۔"

اس آیت مبارکہ میں حکومت الٰہیہ کے قیام کے لیے چار ارکان بھی بتادیے گئے۔ یعنی ۱۔ رسول ۲۔ کتاب ۳۔ میزان ۴۔ جنگی سامان۔

غرض کہ فرد، جماعت اور ان سب کی حکومت اور بقا کے لیے یہی اصول اور یہی ارکان ہیں جن سے مکمل اصلاح معاشرہ اور صحیح ضابطۂ حیات تیار ہو سکتا ہے۔

"فرمایا حضرت صاحب مدظلہ نے"

اگر ہم آپ حضور ﷺ کے امتی ہیں تو دیکھیں کہ ہم کس کس حکم پر عمل کرتے ہیں اور کس پر نہیں کرتے۔

قربِ الٰہی

(آہنگ۔ ریڈیو پاکستان۔ ۱۹۸۴ء)

اللہ پاک نے انسان کی تخلیق کی تو اس کے مقام کو اس قدر بلند بنایا کہ فرشتے بھی اس سے رشک کرنے لگے۔ سورۃ البقرہ(۳۰۔ ۳۲) میں اس واقعے کا ذکر اس طرح آتا ہے کہ "جب تمھارے رب نے فرشتوں سے فرمایا' میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔ وہ بولے کیا ایسے کو (نائب) کریگا جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خوں ریزی کرے گا اور ہم تو تجھے سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ فرمایا' مجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام(اشیاء کے) نام سکھائے' پھر سب (اشیاء) کوملائکہ پر پیش کرکے فرمایا' تم سچے ہو تو ان کے نام بتاؤ' بولے پاکی ہے تجھے' ہمیں کچھ علم نہیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا بے شک تو ہی علم و حکمت والا ہے۔"

پھر سورۃ الاحزاب (۷۲) میں انسان کے قابلِ رشک مقام کا اس طرح ذکر ہے کہ "بے شک ہم نے امانت پیش فرمائی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھا لیا۔ بے شک وہ اپنی جان کو مشقت میں ڈالنے والا بڑا نادان ہے۔" حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ "(یہ امانت جس کا یہاں ذکر ہے) اس سے مراد طاعت اور فرائض ہیں۔" یعنی بندہ صرف اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری اور احکام پر قائم رہنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور یہی وہ رشتہ ہے جس سے قربِ الٰہی اور نیابتِ الٰہی وغیرہ کے مقامات اسے حاصل ہوسکتے ہیں' اور وہ اللہ سے اس قدر قریب ہوسکتا ہے کہ گویا اللہ اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہو۔

سورہ قٓ (۱۴) میں ارشاد ہے کہ "اور بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں کہ جو وسوسہ اس کا نفس ڈالتا ہے اور ہم شہ رگ سے بھی اس سے زیادہ قریب ہیں۔"

جب انسان کی کوئی بات اللہ تعالٰی سے پوشیدہ نہیں اور وہ اللہ سے اس قدر قریب ہے تو اس کا فرض ہے کہ اس کی فرماں برداری کرے اور اپنے منصب کو اپنے ہاتھ سے جانے نہ دے۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ اللہ پاک نے بندے کو پیدا کرکے اسے فضول زندگی نہیں دی بلکہ ہر زمانے میں اس کی رہبری اور ہدایت کے لیے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا تاکہ وہ غیر اللہ کو اپنا معبود نہ بنائے اور اپنے سے کم درجے کی مخلوق کے آگے سر نہ جھکائے۔ یہ ہدایت، اللہ تعالٰی کی خاص محبت اور خاص لطف و کرم کی نشانی ہے کہ وہ پیدا بھی کرتا ہے، اسکے لیے رزق بھی مہیا کرتا ہے اور اس کو ہدایت بھی بہم پہنچاتا ہے تاکہ وہ اپنے منصب سے ہٹنے نہ پائے اور اپنے مقام کو چھوڑ نہ بیٹھے۔

انسان کے اس بلند منصب کی بقا کے لیے بھی اللہ تعالٰی نے نہایت جامع اصول سمجھا دیا۔ سورہ آل عمران (۳۱) میں ارشاد ہے کہ:۔

(اے میرے محبوبؐ) آپ فرمادیں کہ لوگو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرے محبوب (یعنی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے) فرماں بردار ہوجاؤ (پھر) اللہ تم سے محبت رکھے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

یعنی اللہ سے محبت اور اللہ کا قرب اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی جائے۔ اسی پیروی سے مغفرت بھی حاصل ہوگی اور اللہ کی رضا بھی حاصل ہوگی جو دنیا اور آخرت کی فلاح کی ضامن ہے۔

اللہ تعالٰی نے قرآن پاک میں جگہ جگہ اس قرب پر زور دیا ہے، کیوں کہ یہی قرب

دراصل تقویٰ اور اللہ کے خوف کا ذریعہ ہوتا ہے۔ بلکہ سورۃ الحج (۳۷)میں حج کی قربانی کے سلسلے میں یوں بھی فرمادیا کہ ''اللہ کو ان کے گوشت ہرگز نہیں پہنچتے اور نہ ان کے خون لیکن تمھاری پرہیزگاری اس تک باریاب ہوتی ہے۔'' یعنی پرہیزگاری اور تقویٰ ہی اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ہے۔ اور اس پرہیزگاری کی کامیابی صرف حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی سے میسر آتی ہے۔ جب یہ غلامی نصیب ہوجاتی ہے تو بندہ صرف اپنے رب کے لیے جینا چاہتا ہے اوراسی کے لیے مرنا چاہتا ہے۔ سورۃ الانعام(۱۶۲) میں ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

''(اے محبوبؐ) آپ فرمادیں کہ بے شک' میری نماز اور میری قربانیاں' اور میرا جینا مرنا سب اللہ کے لیے ہے جوسارے جہانوں کا رب ہے۔''

یعنی بندہ اسی وقت صحیح معنی میں قربِ الٰہی حاصل کرسکتا ہے جب کہ اس کا مرنا اور اس کا جینا سب کچھ اللہ کے لیے ہو اور ایسی زندگی صرف حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل پیروی اور غلامی ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔

عیدالاضحیٰ

(آہنگ ۔ ریڈیو پاکستان ۔ نومبر ۱۹۷۷ء)

دنیا کی ہر قوم کے لیے سال بھر میں دو چار دن ایسے ضرور آتے ہیں جن کو وہ اپنے قومی جشن کی یادگار سمجھ کر عزیز رکھتی ہے اور قوم کے ہر فرد کے لیے یہ دن خوشیوں اور مسرتوں کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ غیروں کے جشن لذائذ دنیوی اور خواہشات کی جستجو تک محدود ہوتے ہیں لیکن مسلمانوں کا سب سے بڑا جشن یہ ہوتا ہے کہ وہ درگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہوں، ان کی زبان پر ذکر الٰہی ہو۔ وہ اس مبارک دن میں محبوب حقیقی سے اپنا تعلق زیادہ استوار کریں اس کی رضا جوئی میں اپنے مال و متاع قربان کریں۔ عیدالاضحیٰ میں مسلمان اپنی بندگی کے عہد کی تجدید حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر عمل پیرا ہو کر کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جلیل القدر نبی تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو مختلف آزمائشوں میں مبتلا فرمایا۔ اور وہ ان میں پورے اترے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے لڑکے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس کی تعبیر یہ سمجھی کہ ان کو راہ خدا میں صدقہ دینے کا حکم دیا جارہا ہے۔ چناں چہ انھوں نے چند اونٹ اللہ کے نام پر خیرات کردیے لیکن جب دوبارہ اور سہ بارہ وہی خواب دیکھا تو انھیں یقین ہوگیا کہ بیٹے کی قربانی کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔ کیا بڑی آزمائش تھی بوڑھے ماں باپ ہیں، ۱۲ یا ۱۳ برس کا اکلوتا بیٹا، بڑھاپے کا واحد سہارا ہے۔ وہ بیٹا بھی بڑی دعاؤں کے بعد عطا ہوا تھا۔ اب اس کی قربانی کا مطالبہ کیا جارہا ہے وہ بھی اس شان سے کہ ماں بچے کو نہلائے دھلائے اور سجائے اور ایسا خراماں خراماں باپ کے ساتھ ذبح ہونے جائے اور باپ اپنے لخت جگر کو اپنے ہاتھ سے ذبح

کرے ایسا واقعہ دنیا نے نہ کبھی دیکھا ہوگا اور نہ سنا ہوگا۔

چناں چہ ماں نے بیٹے کے غسل کا انتظام کیا عمدہ لباس پہنایا خوشبو لگائی اور باپ بیٹے کو رخصت کیا۔ جب باپ نے بیٹے سے کہا کہ بیٹا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کررہا ہوں' اس بارے میں تیری کیا رائے ہے۔ فرماں بردار بیٹے نے جواب دیا کہ اباجان! آپ کو جیسا حکم دیا گیا ہے ویسے عمل کیجیے انشاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔ ذبح کے وقت یہی فرماں بردار بیٹا یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ ابا جان میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیں تاکہ ذبح ہوتے وقت میں تڑپ نہ سکوں اور بے صبر شمار نہ کیا جاؤں۔

چھری تیز کی جاتی ہے' بیٹے کو لٹایا جاتا ہے' گلے پر چھری چلائی جاتی ہے لیکن چھری حکم ربّی سے کاٹنے سے معذور رہی۔ خدا کی طرف سے قربانی کے لیے دنبہ پیش کیا گیا۔ اس امتحان کا نقشہ قرآن حکیم میں ان الفاظ میں کھینچا گیا۔

"پھر جب ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام دونوں اللہ کے آگے جھک گئے۔ ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے کے لیے ماتھے کے بل گرادیا تو ہم نے پکارا۔ اے ابراہیمؑ بس کر۔ تم نے اپنے خواب کو پورا کردکھایا۔ ہم نیک بندوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ بے شک یہ بڑی آزمائش تھی ہم نے ایک بڑی قربانی دیکر اسمٰعیل کو چھڑا لیا اور اس قربانی کو آنے والی نسلوں میں جاری کردیا۔ سلامتی ہو ابراہیمؑ پر۔" (سورۃ الصّٰفّٰت)

لیکن یہ قربانی کیا تھی۔ یہ محض خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی بلکہ روح اور دل کی قربانی تھی۔ یہ ماسوا اللہ اور غیر کی محبت کی قربانی راہ خدا میں تھی۔ یہ اپنی عزیز ترین متاع کو خدا کے سامنے پیش کردینے کی نذر تھی۔ یہ خدا کی اطاعت عبودیت اور کامل بندگی کا بے مثال منظر تھا۔ یہ تسلیم و رضا اور صبروشکر کا امتحان تھا۔ یہ باپ کا

اکلوتے بیٹے کے خون سے زمین کو رنگین کر دینا نہ تھا بلکہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشوں، تمناؤں اور آرزوؤں کی قربانی تھی۔ خدا کے حکم کے آگے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو معدوم کر دینا تھا۔

عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی دینے سے جہاد کی عملی تربیت ہوتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے قربانی کرنے سے انسان میں جرأت اور دلیری پیدا ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے اندر ایک عزم پیدا کرتا ہے کہ وہ دین و ملت کے مفاد کی خاطر وقت آنے پر اپنا خون بہانے سے دریغ نہیں کرے گا۔

انسان کے لیے مال کی محبت بڑا فتنہ ہے۔ قربانی کے لیے کافی مال خرچ کرنا پڑتا ہے، اس طرح اعلیٰ مقاصد کے لیے مال خرچ کرنے کی عادت ڈالی جاتی ہے۔ عیدالاضحیٰ ہمارے لیے ایثار و خدمت کا موقع بھی فراہم کرتی ہے۔ قربانی کے گوشت کا ایک تہائی اقربا کے لیے اور ایک تہائی غرباء کے لیے مقرر کیا گیا ہے تاکہ امت کے تمام لوگ اس مبارک دن کی خوشیوں سے محظوظ ہو سکیں۔

عیدالاضحیٰ کی اصل شان تو بیت اللہ ہی میں نظر آتی ہے۔ یہاں بندگی اور مساوات کا بے نظیر مظاہرہ ہوتا ہے۔ خوش نصیب مسلمان پکار پکار کر کہتے ہیں اے اللہ ہم تیرے در پر حاضر ہیں وہ اپنی تمام گذشتہ عمر کے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں۔ خدا کے حضور میں گڑگڑاتے ہیں، روتے ہیں، قصور معاف کراتے ہیں، آئندہ زندگی کے لیے خدا سے اس کی عبودیت، بندگی اور اطاعت کا نیا عہد و پیماں باندھتے ہیں۔

مساوات کا منظر بھی قابل دید ہوتا ہے۔ دنیا کے تمام گوشوں سے مختلف نسلوں اور زبانوں کے مسلمان جمع ہوتے ہیں لیکن سفید و سیاہ اور شاہ و گدا ایک ہی قسم کے اَن سلے اور سادہ لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔ وہاں نہ کوئی کسی کو بڑا مانتا ہے اور نہ کوئی کسی کو حقیر جانتا ہے۔ ہر کوئی خود کو گناہ گار اور محتاج تصور کرتا ہے او

اور انکساری ہی میں نجات نظر آتی ہے۔

قرآن کریم میں قربانی کی غایت کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے کہ "اللّٰہ کے پاس قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ تقویٰ کے بغیر دونوں جہانوں کی کامیابی ناممکن ہے"۔

مختصراً" یہ مبارک تقریب خوشیوں کے ساتھ ساتھ ہمیں زندگی کے بلند مقاصد کے حصول کے لیے عزم و عمل کے مواقع فراہم کرتا ہے اور وہ مقاصد خدا کی اطاعت جہاد بالنّفس، جہاد بالمال، خدمتِ خلق، ایثار و ہمدردی اور مساوات ہیں۔ حسنِ اخلاق کے سلسلے میں خندہ پیشانی، پرتپاک خیرمقدم اور ملن ساری کی تعلیم دی گئی ہے تاکہ اسلامی معاشرہ اخلاص اور محبت کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوسکے۔

شب براءت

(آہنگ - ریڈیوپاکستان - اپریل ۱۹۸۸ء)

قرآن پاک میں لیلۃ القدر اور لیلۃ المبارکہ (جو سورۃ الدخان میں مذکور ہے)اور دونوں راتوں کو صرف شب قدر ہی قرار دیا جاتا ہے اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ سال بھر میں جو کچھ ہونے والا ہوتا ہے یعنی رزق موت و حیات اوربارش وغیرہ وہ سب شب قدر میں لوح محفوظ سے نقل کرلیا جاتا ہے۔ لیکن بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ”شب قدر اور شب براءت دونوں میں تمام واقعات اور معاملات فیصل ہوتے ہوں تو یہ کچھ بعید نہیں بلکہ ممکن ہو کہ واقعات تو لکھ لیے جاتے ہوں۔ شب براءت میں اور (ملائکہ کے)سپرد کیے جاتے ہوں شب قدر میں۔ بہرحال شب براءت ایسی رات ہے جس میں بندوں کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں اور یہ اس ماہ شعبان میں واقع ہوتی ہے جس کے متعلق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:۔

”شعبان میرا مہینہ ہے۔“

مفسرین نے لکھا ہے کہ جس طرح حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہ السلام سے افضل ہیں اسی طرح آپؐ کا مہینہ سب مہینوں سے افضل ہے۔ اسی ماہ میں شب براءت یعنی پندرھویں شب واقع ہوتی ہے جس کے متعلق حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

”حق تعالیٰ پندرھویں شب میں آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے اور(مغفرت چاہنے والے) تمام گناہ گاروں کی مغفرت فرمادیتا ہے سوائے اس کے کہ:۔

۱۔ جو مشرک ہو۔

۲۔ جس کے دل میں کینہ ہو۔

۳۔ جادوگر ہو۔

۴۔ غیب کی خبر بتانے والا ہو جیسے فال والے یا حاضرات والے ہوتے ہیں۔

۵۔ ہاتھ کے خطوط یا دوسرے آثار دیکھ کر بتانے والا ہو۔

۶۔ قاطع رحم ہو۔

ایک روایت میں ان لوگوں کا استثنا بھی آیا ہے جو ٹخنے سے نیچے پاجامہ یا ازار پہنتے ہیں۔ جو ماں باپ کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ اس لیے اس رات کو شب براءت کہتے ہیں یعنی تمام گناہوں سے نجات اور خلاصی ہوجاتی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ شب براءت ہے ' براءت کے معنی حصے کے ہیں ۔ سال بھر کا حصہ رزق یا موت وغیرہ کا اسی رات کو مقرر ہوتا ہے اس لیے اس رات میں زیادہ سے زیادہ استغفار اور عبادت ہی مفید ہوسکتی ہے۔ ابن ماجہ اور بیہقی کی حدیث ہے کہ:۔

"کوئی طالب رزق ہے کہ میں اسے رزق دوں؟ کوئی مبتلائے مصیبت ہے کہ میں اسے عافیت دوں یہاں تک کہ فجر طلوع ہوجاتی ہے۔"

اس حدیث سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ رات شب براءت بھی ہے کہ سال بھر کا رزق اور حصہ نصیب ہوتا ہے۔ اسی سلسلے میں عطا بن یسار نے کہا کہ:۔

"اس رات کو ملک الموت کو ایک فہرست مل جاتی ہے کہ جن لوگوں کا نام اس میں درج ہے اس کی جان اس (سال میں) قبض کرنا۔ تو کوئی شخص درخت لگاتا ہوتا ہے' کوئی نکاح کررہا ہوتا ہے' کوئی مکان تعمیر کررہا ہوتا ہے لیکن اس کا نام مُردوں میں لکھا جاچکا ہوتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ اس رات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پایا تو میں تلاش میں نکلی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بقیع (یعنی مدینہ منورہ کے قبرستان) میں تھے۔ آپ نے فرمایا کہ:۔

"اس رات میں اللہ تعالیٰ' آسمان زمین پر نزول فرماتا ہے اور قبیلہ بنی کلب کی بکریوں کے بالوں کی گنتی سے زیادہ بخشش فرمادیتا ہے اوراس کی رحمت کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوتے ہیں بشرطیکہ کوئی مانگنے والا بھی تو ہو۔" بعض نے لکھا ہے کہ:۔

"اس مہینے میں پندرھویں شب کی بہت فضیلت ہے کہ اُترتے ہیں رحمت کے فرشتے اور نازل ہوتی ہے رحمت الٰہی اس شخص پر جو کہ عبادت کرتا ہے اور بخشتا ہے اللہ تعالیٰ نیکوں کو اور بدوں کو" اور ان تمام مباحث کو ہمارے علماء نے اس طرح اجمالاً بیان کیا ہے کہ:۔

۱۔ پندرھویں شب میں قبرستان جاکر مردوں کے لیے دعا اوراستغفار کرنا مستحب ہے۔

۲۔ کچھ صدقہ' خیرات یا کھانا وغیرہ پکا کر بخشش دینا بھی مناسب ہے۔

۳۔ اس شب میں بیدار رہ کر عبادت کرنا (خواہ خلوت میں ہو یا جلوت میں) افضل ہے لیکن اجتماع کا اہتمام نہ کیا جائے۔

۴۔ پندرھویں تاریخ کو روزہ رکھنا مستحب ہے اور اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم اس ماہ میں کثرت سے روزہ رکھتے تھے۔ البتہ ۱۵شعبان کے بعد روزہ رکھنے کی ممانعت جو حدیثوں میں آئی ہے وہ اس شخص کے لیے ہے جس کو احتمال ہو کہ ضعف ہوجائے گا اور پھر وہ رمضان کا روزہ بے رغبتی سے رکھے گا۔

۵۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ کثرت نوافل اور نماز روزہ سے اس مہینے کو آباد رکھیں۔

البتہ اس رات خصوصیت کے ساتھ حلوا پکانا اور اس کو شرعی سمجھنا غلط ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کا دندان مبارک جب شہید ہوا تو آپؐ نے حلوا نوش فرمایا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت امیرحمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت اسی دن ہوئی تھی اور یہ ان کی فاتحہ ہے تو یہ باتیں بے اصل ہیں اور یہ

دونوں واقعے شعبان کے نہیں تھے بلکہ شوال کے تھے۔ بعض لوگ پٹاخے چھوڑنا ضروری سمجھتے ہیں یہ بالکل لغو بات ہے اور فضول خرچی بھی ہے اور لہو و لعب بھی۔ قرآن پاک میں مال کے فضول اڑانے والوں کو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے۔ پھر آتش بازی سے ہاتھ پاؤں یا مکان جلنے کا امکان ہے اور یہ رسم غالباً ہندوؤں کی دیوالی یا برامکہ کی آتش پرستی کی یادگار ہے اس لیے اس سے احتراز لازمی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ یہ رات فضیلت والی ہے اس لیے اس میں عبادت کرنا چاہیے۔ مغفرت طلب کرنا چاہیے۔ اپنے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کی معافی مانگنی چاہیے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات کو جاگنے اور دن کو روزہ کی رغبت دلائی ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کے قبرستان میں تشریف لے جاکر مُردوں کی بخشش کے لیے دعا فرمائی ہے۔ چنانچہ یہی عمل صحیح ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ مُردوں کے لیے ایصال ثواب کیا جائے۔ چاہے قرآن شریف پڑھ کر، چاہے غریبوں کو کھانا کھلا کر، چاہے ان کو نقد دے کر، چاہے بخشش کی دعا کر کے۔ غرض یہ کہ یہ طریقے سب سنت کے مطابق ہیں باقی جو لہو و لعب اور خرافات کے مظاہرے ہوتے ہیں ان سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ اللہ پاک ایسی فضولیات سے بچائے۔ (آمین)

صبرو ثبات

(آہنگ ۔ ریڈیو پاکستان ۔ جون ۱۹۸۴ء)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صبرو ثبات، تسلیم و رضا اور استقلال و استقامت کی ایسی شان رکھتے تھے کہ سخت سے سخت اضطراب و اضطرار کے عالم میں بھی پائے ثبات کو ذرا سی جنبش بھی نہیں ہوتی تھی۔ ایک صحابی نے آپؐ سے دریافت کیا کہ "یارسول اللہ! سب سے زیادہ مصیبت کس پر آئی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ پیغمبروں پر، پھر اسی طرح درجہ بدرجہ لوگوں پر۔" اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سورہ احقاف (۳۵) میں کہا گیا ہے:۔

"اے میرے حبیب جس طرح اُولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا، تم بھی صبر کرو" یعنی مصائب میں صبر کرنا انبیاء علیہم السلام کی امتیازی شان ہے اور چوں کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم افضل الانبیاء تھے اس لیے اس وصف میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت سب سے زیادہ امتیازی تھی۔

صبر کے لغوی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں اور قرآن و سنت کی اصطلاح میں نفس کو طبیعت کے خلاف چیزوں پر قائم رکھنا صبر کہلاتا ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں ۔

(۱) طاعات پر صبر کرنا، یعنی احکام الٰہی کی پابندی کرنا، خواہ وہ پابندی طبیعت پر کتنی شاق کیوں نہ ہو۔

(۲) نافرمانیوں سے صبر کرنا۔ یعنی جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے، وہ خواہ نفس کو بہت مرغوب ہی کیوں نہ ہوں، ان سے نفس کو روکنا۔

(۳) مصائب پر صبر کرنا۔ یعنی ہر تکلیف اور ہر پریشانی کو اللہ تعالیٰ کی فرستادہ سمجھ کر اس سے خوش ہونا۔

انبیاء علیہم السلام اور خاص طور پر ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم اس آخری قسم کے مطابق ہر مصیبت کو رضائے الٰہی سمجھ کر اس سے راضی ہوتے تھے اور ذرہ برابر بھی پریشان نہ ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام مصائب کا علاج صبرو تقویٰ ہی بتایا ہے۔

سورہ آل عمران (۱۲۰) میں ارشاد ہے:۔

"اگر تم صبراور تقویٰ اختیار کرو تو(مخالفین کی)چالیں ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔"

سورہ یوسف(۹۰)میں بھی ارشاد ہے کہ" بے شک جو شخص تقویٰ اور صبر اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ (ایسے) نیکی والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔"

گویا تقویٰ اور صبر ہر نیکی کرنے والوں کا شیوہ ہوا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی ان کو اجر دینے والا ہے۔

حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی شروع ہی سے صبرو تقویٰ سے عبارت تھی۔ کون سا واقعہ اور کون سی ساعت ایسی تھی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبرو ثبات کا ثبوت نہ دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان صفات کا عادی بنادیا تھا۔

ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بچے تھے کہ والدہ نے داغ مفارقت دیا۔ اس کے دو برس بعد دادا بھی رحلت فرماگئے۔ پھر نبوت کے ابتدائی دور میں چچا بھی چل بسے۔ کوئی غور کرے کہ ایسے حالات میں جب کہ کوئی سرپرست نہ ہو انسان اور عام شخص پر کیا گذرتی ہوگی۔ لیکن اشرف الانبیاء علیہ الصلواۃ والسلام نے ایسے تمام مصائب کو مردانہ وار برداشت کیا۔ اور صبر وثبات کو اس درجہ اپنایا کہ دنیا میں اس کی مثال نظر نہیں آتی۔

لوگوں نے پتھر برسائے' راستے میں کانٹے ڈالے' سر پر اوجھ پھینکی اور لہولہان کیا'

لیکن صبر کا دامن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نہیں چھوڑا۔ یعنی جب آپؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام تبلیغ شروع کی تو شرپسندوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر طرح سے ستانا شروع کیا، آوازے کسے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر، جادوگر یا پاگل کہتے اور مختلف الزامات تراشتے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کیا۔ غریب مسلمانوں کو کافروں نے گرم ریت اور گرم پتھروں پر لٹایا، چھاتی پر بھاری پتھر رکھے۔ گرم لوہے سے داغا اور سخت زدوکوب کیا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کیا۔ سُمیہ جو یاسر کی بیوی تھی ابوجہل کی برچھی سے جاں بحق ہوئیں۔ زنیرہ ایک باندی تھیں ابوجہل کی ضرب سے اندھی ہوگئیں۔ حضرت عثمانؓ کو رسی سے باندھ کر گھسیٹا گیا۔ حضرت زبیرؓ کو ان کے چچا نے چٹائی میں لپیٹ کر جلانا چاہا۔ ایسے تمام مظالم پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کیا۔ پھر ابوطالب کی گھاٹی میں تین سال تک آپؐ کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو نظربند کردیا اور کھانے پینے سے بھی روک دیا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کیا۔

دسویں سال نبویؐ میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب اور غم گسار اہلیہ یعنی حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوا تو کافروں کو میدان خالی ملا اور انھوں نے جی بھر کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر خاک پھینکنا، پتھر برسانا، گردن مبارک میں چادر کا پھندہ ڈالنا وغیرہ بکثرت مظالم اسی زمانے میں ہوئے۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ کے لیے طائف تشریف لے گئے تو آپ کو لہولہان کیا۔ درد کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ جاتے تو وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بازو پکڑ کر کھڑا کردیتے پھر پتھر مارتے اور گالیاں دیتے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر بھی صبر کرتے اور دعا فرماتے کہ ان لوگوں کی نسل سے کوئی مومن پیدا ہوجائے۔

پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرماکر مدینہ تشریف لے گئے تو مکہ والوں

نے آپؐ کے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہاجر مسلمانوں کے مکانات اور جائیدادوں پر قبضہ کرلیا اور تمام مسلمانوں کو حج سے روک دیا۔ لیکن پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کیا۔ قبیلہ کلاب کے رئیس نے مسلمانوں کو نجد میں تبلیغ کی دعوت دی۔ حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے نجد کی طرف سے ڈر ہے۔ لیکن اس شخص نے ضمانت لی اور غلط مشورہ دیا۔ ستر مبلغین وہاں تشریف لے گئے۔ سوائے ایک کے سب کے سب قتل کردیے گئے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کیا اور ذرا بھی پریشان نہ ہوئے۔ حدیبیہ کی صلح جو بظاہر مسلمانوں کے ضعف کو ظاہر کرتی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گوارا فرمائی۔ کیوں کہ اس کے بعد ہی فتح مبین کی بشارت ملی۔

پھر جب ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو وہاں کے بڑے بڑے سردار جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن تھے اور مسلمانوں کے قاتل بھی تھے حرم کے صحن میں تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نظر اٹھا کر دیکھا اور پوچھا کہ "اے مکہ کے سردارو! آج میں تمھارے ساتھ کیا برتاؤ کروں گا؟" سب نے کہا:

"آپ جوانوں کے شریف بھائی اور بوڑھوں کے شریف بھتیجے ہیں۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جاؤ آج تم پر کوئی ملامت نہیں، تم سب آزاد ہو!!"

یہ عام معافی بالکل غیر متوقع تھی لیکن رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ظالموں سے یہی کچھ کرنا چاہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ کی لاش کے ٹکڑے کرنے والی ہندہ آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عرض کرنے لگی کہ:

"یارسول اللہ آج سے پہلے مجھے آپؐ کے خیمے سے زیادہ کسی خیمے سے نفرت نہ تھی مگر آج آپ کے خیمے سے زیادہ کوئی خیمہ مجھے پیارا معلوم نہیں ہوا۔"

اس طرح صبرو ثبات کی مختلف آزمائشوں سے اور سخت اذیتوں کے بعد دشمنوں کے سارے منصوبے ناکام ہوئے۔ کفر کی ساری قوتیں ٹوٹ گئیں اور اسلام کا پرچم ہر طرف لہرانے لگا۔

حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم نے صبرو ثبات کی فضیلت میں فرمایا ہے کہ:۔

"مومن مرد اور عورت' زندگی کے اندر مصائب میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں کبھی ان کی جان کو تکلیف پہنچتی ہے اور کبھی مال میں نقصان آجاتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس طرح حاضر ہوتے ہیں کہ ان مصائب پر صبر کرنے سے ان کے تمام گناہ مٹ چکے ہوتے ہیں۔"

ایک حدیث ہے کہ:۔

"مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ اس کا ہر کام خیر ہی خیر ہے اور یہ سعادت مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ وہ یہ کہ اگر اسے کوئی تکلیف یا صدمہ پہنچتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے تو یہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے اور اگر اسے کوئی خوشی یا فراخی حاصل ہوتی ہے تو وہ شکر ادا کرتا ہے'تو یہ بھی اس کے لیے بہتر ہوتا ہے' یعنی وہ ہر حال میں خیر ہی خیر حاصل کرتا ہے۔"

ایک اور حدیث میں حضرت ابوالدرداؓ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"مجھ سے میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہرانا' خواہ تیری بوٹیاں کاٹ دی جائیں اور تجھ کو آگ میں جلادیا جائے۔"

ایسی مثالیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں میں ملتی ہیں'اور صبر کی یہی اعلیٰ قسم حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں شروع سے آخر تک نظر آتی ہے۔

اسلام کا فلسفہ اخلاق

خوف و رجاء

(آہنگ - ریڈیو پاکستان - ۱۹۸۳ء)

حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:۔

(انّما بعثت لاتمّم حسن الاخلاق) "میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔"

اخلاق دراصل ان تعلقات کو کہتے ہیں جو بنی نوع انسان کے باہمی اشتراک کے لیے ضروری ہیں کیوں کہ انسان کو اس دنیا اور اس دنیا والوں میں رہنا ہے۔ ملنا جلنا' اٹھنا بیٹھنا' کام کاج کرنا اور مختلف اقسام کے روابط کو استوار کرنا انسان کی ضروریات میں سے ہے۔ اگر لوگوں کے حقوق ادا نہ کیے جائیں' ان کے معاملات میں تعاون نہ ہو' ان کی مشکلات کو رفع کرنے کا جذبہ نہ ہو' ان کے ساتھ ہمدردی نہ کی جائے۔ اور ایثار و قربانی کا کوئی مظاہرہ نہ ہو تو یہ زندگی بالکل درہم برہم ہو کر رہ جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات انسانی معاشرے کے ہر پہلو کے لیے مشعل ہدایت ہیں۔ پھر آخرت کا خوف بھی ایک مسلمان کا ضروری عقیدہ ہے۔ کیوں کہ ارشاد نبویؐ ہے:۔

(الایمان بین الخوف والرجاء) "ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے۔"

خدا کا خوف نہ ہو' حساب کتاب کی پروا نہ ہو' سزا جزا کا خیال نہ ہو تو انسان جو چاہے کر سکتا ہے حق تلفی' ظلم تعدی' دھوکے بازی' دغابازی' غداری' بے ایمانی وغیرہ جتنے رذائل ہیں' وہ رذائل ہی اس لیے ہیں کہ اللہ پاک نے انھیں برا کہا ہے اور وہ جب برے قرار دیے گئے ہیں تو ظاہر ہے کہ خدا کے نزدیک ان کے مرتکبین' جہنم میں

جھونکے جائیں گے تو جہنم کا خوف ایک مسلمان یعنی (راسخ العقیدہ مسلمان) کو ان تمام برائیوں سے بچاتا ہے اور اسے اس "امید" پر قائم کردیتا ہے جس کی منزل جنت ہے اور جو اللہ پاک کی پسندیدہ اور فرماں بردار بندوں کا ٹھکانا ہوگا۔ اگر خوف کی طرح رجاء (امید) کا عقیدہ نہ ہو تو ایک مسلمان، نیکی کی طرف کیوں مائل ہوگا اور کیوں فضائل کو اختیار کرے گا وہ تو اللہ کی خوشنودی چاہتا ہے اس لیے اس کے احکام پر عمل کرتا ہے۔ ایسے عمل سے خود بندے کی دنیا بھی درست ہوجاتی ہے۔ یعنی دنیا کا فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے اور انعام میں جنت بھی مل جائے گی۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ خوف و رجاء کی تعلیم ملتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو نذیر اسی لیے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ کا خوف دلائیں اور لوگوں کو رذائل سے بچائیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی چند صفات جو سورۃ الاحزاب (۴۵ - ۴۷) میں ہیں ان میں بھی خوف و رجاء کی تعلیم کا ذکر ہے۔

اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) بے شک ہم نے آپ کو بھیجا شاہد، خوشخبری دینے والا اور ڈرسنانے والا اور اللہ کی طرف سے اس کی جانب بلانے والا اور روشن کرنے والا چراغ بناکر بھیجا۔ اور ایمان والوں کو خوشخبری دو کہ ان کے لیے اللہ کا بڑا فضل ہے۔

ان آیات میں شاہد بھی صفت ہے یعنی آپؐ نے تمام غیبی باتوں کو اللہ کے فضل سے خود دیکھا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) خوشخبری دینے والے بھی ہیں کہ ایمان والوں کی دنیا خوف و حزن سے پاک ہوگی اور آخرت بھی اس سے پاک ہوگی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نذیر ہیں کہ آپؐ نے بدعملی اور اللہ کی نافرمانی کے نتائج سے سب کو ڈرایا اور آگاہ کردیا ہے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کی طرف بلانے والے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) روشنی دکھانے والے چراغ ہیں۔

ان آیات کے علاوہ بہت سی آیتیں امید اور رجاء سے متعلق اور بھی ہیں۔ سورۃ

الحجر(۵۵) میں ابراہیم علیہ السلام سے ارشاد ہے کہ:۔

"آپ ناامید لوگوں میں سے نہ بنیں۔"

سورہ یوسف(۸۷) میں یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں سے ارشاد فرماتے ہوئے اس طرح یاد کیے جاتے ہیں کہ:۔

(ولا تیئسوا من روح ولا یائسوا من روح اللّٰہ الّا الکافرون)

"اور بے شک اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتے مگر کافر لوگ۔"

اسی طرح کئی جگہ ارشاد ہے جس سے ظاہر ہے کہ اللہ پاک کی رحمتوں سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ لیکن اس سے ڈرنا ضروری ہے تاکہ اسکے خوف سے دنیوی زندگی برائیوں سے بچ سکے اور معاشرے کو کسی طرح کا ضرر نہ پہنچے کیوں کہ اسلام سراپا امن و آشتی کا مبلغ ہے اور صرف اسلام کے ذریعے انسانی زندگی کو سکون مل سکتا ہے۔

"فرمایا حضرت صاحب مدظلہ نے"

اللہ پاک متقیوں اور اس سے ڈرنے والوں ہی کا عمل قبول فرماتا ہے۔ اس کی بارگاہ میں عاجزی اور انکساری سے اپنی درخواست پیش نہ کریں گے تو کس طرح ہمارے کام بن سکتے ہیں۔

فرض شناسی (۱)

(قرآن حکیم اور ہماری زندگی۔ ریڈیو پاکستان۔ جون ۱۹۶۶ء)

ولقد کرمنا بنی ادم و حملنا ــــــــــــــــ تفضیلا۔

ترجمہ۔ اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا میں سوار کیا۔ اور نفیس نفیس چیزیں ان کو عطا کیں۔ اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اپنی تمام مخلوقات پر فضیلت بخشی اوراسی فضیلت کے سبب سے اس پر ذمہ داریاں عاید کیں جو شخص جس قدر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرے گا اور جتنا اپنے فرض کو پہنچانے گا اتنا ہی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز ہوگا۔ قرآن پاک نے اسی اصول کو ایک جگہ اس طرح بیان کیا ہے۔

انّ اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم۔ (سورہ حجرات)

یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سب سے باعزت وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔ اور تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ انسان ہر عمل میں اس پر غور کرے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا حکم کیا ہے اور اس معاملے میں ہمارے فرائض کیا ہیں۔ اور جس قدر ان فرائض کی بجا آوری کی جائے گی۔ اسی قدر عزت و کامیابی حاصل ہوگی۔ قرآن ان حقوق و فرائض ہی کی تفصیل کے لیے نازل کیا گیا تاکہ بندے اپنے فرائض کا علم حاصل کریں۔ معاشرتی زندگی کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک تو بشر کی انفرادی زندگی ہے دوسرے گھریلو زندگی۔ تیسرے گھر سے باہر کے تعلقات ہیں۔ کامیاب انسان وہی ہے جو ان تینوں قسم کے تعلقات اوراپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو۔

---

(۱)۔اسی عنوان سے ایک مضمون "ندائے سحر" میں بھی ہے لیکن وہ مضمون مختلف ہے۔

اگر افراد اپنے فرائض کو پہنچانیں گے تو فرد کی حیثیت سے کامیاب ہوں گے اور جو معاشرہ اس قسم کے افراد پر مشتمل ہوگا وہ معاشرہ صالح ہوگا۔ اور سعادت سے پر ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام لوگوں کو فرض کا احساس اس طرح دلایا کہ:۔

الا کلکم راع فکلکم مسئول عن رعیتہ

"تم میں سے ہر شخص راعی ہے۔ اس لیے تم میں سے ہر شخص سے اس کی رعیت کے متعلق بازپرس ہوگی۔" گویا ہر فرد اپنی اپنی جگہ پر ذمہ دار ہے۔ اور وہ اپنی ذمہ داریوں کا جواب دہ ہے۔ اگر ان حقوق کی جواب دہی کرنی ہے جن کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ سے ہے تو گھریلو زندگی کے متعلق بھی بازپرس ہوگی کہ شوہر کی حیثیت سے، بیوی کی حیثیت سے باپ کی حیثیت سے وہ کیا ہے۔ رشتہ داروں، اہل محلہ اور اہل شہر کے حقوق کا لحاظ کس قدر کرتا ہے۔ اگر حاکم وقت ہے تو محکوموں کے ساتھ اور محکوم ہے تو حاکموں کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ ان تعلقات کو پیش نظر رکھنا اور ان کا پاس رکھتے ہوئے ان کے مطابق عمل کرنا فرض شناسی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان حقوق کو اتنا لازم کردیا ہے کہ عبادات میں کوتاہی اور غفلت کو تو اس نے اپنے ارادہ اور مشیت کے مطابق قابل معافی قرار دیا ہے۔ لیکن حقوق العباد میں کوتاہی کی معافی اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں نہیں رکھی، بلکہ ان بندوں کے ہاتھوں میں رکھی، بلکہ ان بندوں کے ہاتھوں میں رکھی ہے جن کے حق میں کوتاہی ہوئی ہو۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا ہو تو اس ظالم بھائی کو چاہیے کہ اسی دنیا میں وہ اپنے مظلوم بھائی سے اس کو معاف کرالے ورنہ وہاں تاوان ادا کرنے کے لیے کسی کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوگا۔ صرف اعمال ہوں گے۔ ظالم کی نیکیاں مظلوم کو مل جائیں گی اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم کے نامہ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی معاملات میں جو تجاوز اور ظلم ہوگا اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر حج اس وقت تک فرض نہیں کیا جب تک وہ اہل و عیال کے نفقہ کا پورا سامان نہ کرلے اور زکوٰۃ اسی مال میں فرض کی گئی جو اس کے مالک اور اہل و عیال کے مصارف سے زیادہ ہو۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اپنا حق اس وقت تک بندے پر واجب نہیں کیا جب تک وہ بندوں کے حقوق سے عہدہ برا نہ ہولے۔ لیکن ان تمام حقوق کی ادائیگی میں خاص ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کردیا گیا۔ ایک حیوان کے مقابلہ میں انسان کو' اجنبی کے مقابلہ میں دوست کو' غیروں کے مقابلہ میں عزیزوں کو' اور عزیزوں میں جو زیادہ قرابت رکھتے ہوں ان کو تقدم حاصل ہے اور جس طرح ایک انسان پر دوسرے انسان کے حقوق ہیں اسی طرح انسان کا خود اپنے اوپر بھی حق ہے۔

چنانچہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیری بیوی کا تجھ پر حق ہے۔ تیرے ملاقاتی کا تجھ پر حق ہے۔ تیرے بچوں کا تجھ پر حق ہے۔ اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ بے شک تیری جان کا تجھ پر حق ہے۔ تیرے بدن کا تجھ پر حق ہے۔ تیری آنکھوں کا تجھ پر حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے آپ کو ان اعمال کی تکلیف دینے کی مخالفت کی گئی جو اس کی سکت سے باہر ہوں۔ خود اللہ تعالیٰ نے اس دعا کی تعلیم دی کہ:

ربّنا ولا تحملنا ما لا طاقة لنا به

"یعنی اے ہمارے پروردگار ہم پر کوئی ایسا بار نہ ڈال جس کی ہم کو سہار نہ ہو۔" پھر ایک جگہ فرمایا:

لا یکلّف اللّٰہ نفساً الّا وسعها

"اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں

ہو۔"

غرض جملہ حقوق کو اپنے اپنے موقع پر ادا کرنا اور ہر حق میں ان ترتیب کالحاظ رکھنا فرض شناسی کی دلیل ہے اور یہ فرض شناسی دنیاوی اوراخروی نعمتوں سے مالامال کرتی ہے۔

ہم اس کی برکتوں کا حالیہ جنگ میں مشاہدہ کرچکے ہیں۔ تاجروں نے تجارت میں، مجاہدوں نے میدان جہاد میں، شہریوں نے شہری دفاع میں، ملازمین نے ملازمت میں، اساتذہ و طلبہ نے تعلیم گاہوں میں، مزدوروں نے کارخانوں میں۔ غرض کہ ہر شخص نے اپنے اپنے میدان ہائے عمل میں جس فرض شناسی کا ثبوت دیا اس کی مثال شاید ہی تاریخ میں کہیں مل سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں شاندار کامیابی عطا فرمائی۔

اللہ تعالیٰ ہم پاکستانیوں اور جملہ مسلمانان عالم کو اپنے اپنے فرائض پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے۔

آداب گفتگو

(آہنگ ریڈیو پاکستان ۔ مئی ۱۹۸۴ء)

معاشرت کا تقاضا ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے ملیں۔ حال دل کہیں۔ حال دل سنائیں۔ امداد کریں۔ باہمی تعاون سے فرد اور جماعت کے مسائل حل کیے جائیں اور ایک ہو کر رہیں۔ اسلام نے ملنے جلنے اٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کرنے کے بھی آداب اور طریقے بتائے ہیں۔

سورۃ النور(۲۷۔۲۸) میں ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

"اے ایمان والو اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوجاؤ' جب تک اجازت نہ لے لو اور ان میں رہنے والوں کو سلام نہ کرلو۔ تمھارے لیے یہی بہتر ہے کہ اسے یاد رکھو پھر اگر تم اس (گھر) میں کسی کو نہ پاؤ تو تم داخل نہ ہوجاؤ حتیٰ کہ تم کو اجازت دے دی جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ جاؤ۔ تو تم لوٹ جاؤ وہ تمھارے لیے بہت اچھا ہے اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔"

اگر کسی آنے والے سے کہا جائے کہ آپ ابھی واپس تشریف لے جائیں تو یہ بات بظاہر اچھی نہیں معلوم ہوتی لیکن حقیقت میں اس موقع پر یہی بات صحیح ہے۔ گھر والے کس کام میں ہیں۔ کون سی ضرورت ان کے پیش نظر ہے۔ ممکن ہے کوئی مسئلہ وہ تنہا یا صرف گھر والوں میں بیٹھ کر حل کرنا چاہتے ہیں' یہ باتیں باہر سے آنے والا تو نہیں جانتا اس لیے اس کو برا نہیں ماننا چاہیے۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ ایسے موقع پر واپس چلا جانا ہی "تمھارے لیے بہت اچھا ہے۔" لیکن جب آپس میں ملنا ہو تو پہلا کام یہ ہے کہ ایک دوسرے کو سلامتی کی دعا دی جائے۔

سورۃ النسآء(۸۶) میں ارشاد ہے کہ "جب تم کو سلامتی کی دعا دی جائے(یعنی السلام علیکم) کہا جائے تو تم بھی اس سے بہتر سلامتی کی دعا دو(مثلاً" وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ و برکاتہ) یا اسی دعا کو لوٹا دو' بیشک اللہ ہر چیز کا حساب رکھنے والا ہے۔"

یعنی ہماری مجالست جب بھی شروع ہو تو ایک دوسرے کو دعا دی جائے اور وہ دعا (جان و ایمان) کی سلامتی کے لیے ہے جو کسی دوسری قوم کو نصیب نہیں۔

پھر جب ہماری گفتگو شروع ہو تو نہایت نرم لہجے میں ہو جیسا کہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرمایا گیا تھا کہ "پس تم ان سے نرم بات کہنا"(طٰہٰ۔۴۴)

سورۃ لقمان (۱۹)میں فرمایا ہے:۔

"اور اپنی آواز دھیمی کر۔ بہت ہی ناگوار آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔"

ہم سمجھتے ہیں کہ گرج کر کسی کے بات کرنے سے رعب پڑتا ہے اور اس میں اپنی شان ظاہر ہوتی ہے تو ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس طرح بات کرنا انسان کو زیب نہیں دیتا یہ تو گدھوں کی آواز ہے۔ پھر جب ہم بات کریں تو اس کے لیے ارشاد یہی ہے کہ وہ اچھی بات ہو۔ یعنی اچھے انداز سے بھی کہی جائے اور اچھے مقصد کے لیے بھی ہونی چاہیے۔ مفید ہو' نفع بخش ہو۔ یعنی بلاوجہ کی گپ نہ لگائی جائے۔

سورۃ البقرہ(۸۳) میں ارشاد ہے:۔

"لوگوں سے عمدہ طریقے سے بات کرو۔"

اور سورۃ بنی اسرائیل (۵۳) میں فرمایا ہے کہ:۔

میرے بندوں سے کہہ دیجئے کہ وہ بات کہیں جو بہترین ہو۔"

ظاہر ہے کہ "بہترین" اور "احسن" بات وہی ہوگی جو ظاہری و باطنی محاسن والی ہوگی۔ جس میں خیر' فلاح اور فائدہ ہوگا' جو شر و فساد سے دور ہوگی اور جو محبت اور اتفاق کا سرچشمہ ہوگی۔ چناں چہ اس مقصد کے خلاف کوئی بات ہوگی تو وہ احسن نہیں

ہو سکتی۔ ویسی بات محبت اور اتفاق یا خیرو فلاح کے بجائے بغض و عداوت اور طعن و تشنیع وغیرہ کے لیے ہوگی۔ جیسا کہ حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں منافقین کا طرز عمل تھا۔ یعنی ایسے لوگ جب آتے تو اُنظرنا(ہمارا خیال کیجیے) کے بجائے "راعنا" کہتے جس میں تحقیر کا پہلو نکلتا ہے۔ اللہ پاک نے مسلمانوں سے فرمایا کہ:۔

"اے ایمان والو تم راعنا مت کہنا بلکہ اُنظرنا کہنا۔(البقرہ۔ ۱۰۴)

پھر مسلمانوں کے لیے ارشاد ہے کہ وہ ہمیشہ سیدھی اور راستی کی بات کریں تاکہ دشمنی اور عداوت پیدا نہ ہواوران میں تقویٰ اور عمل صالح کا شوق پیدا ہو۔

(سورۃ الاحزاب۔ ۷۰-۷۱) میں ارشاد ہے:۔

"اے ایمان والو۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرو بات سیدھی کرو(تاکہ) اللہ تمہارے کاموں کو سنوارے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا اور جو شخص اللہ کی اور اس کے رسول(صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرتا ہے وہ بہت بڑا نفع اٹھاتا ہے۔"

یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے لوگ ہی سیدھی اور اچھی بات کرتے ہیں اور اس کا اجر یہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے اعمال کو سنوار دیتا ہے اور ان کے گناہوں کو بھی معاف کردیتا ہے اور اگر سیدھی اور اچھی بات نہ ہوگی تو اللہ کے یہاں پکڑ ہوگی۔ اللہ پاک کو ایسی بات ہرگز پسند نہیں۔ صاف صاف ارشاد ہے کہ:۔

"اے ایمان والو تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم نہیں کرتے۔ اللہ کے نزدیک بہت ناپسند ہے کہ تم وہ کہو جو تم نہیں کرتے۔"

یعنی مسلمانوں کا قول اور فعل یکساں ہو۔ ظاہر و باطن میں فرق نہ ہو۔ گویا کسی لحاظ سے منافقت نہ ہو کہ مسلمان کو کسی طرح کی منافقت زیب نہیں دیتی کیوں کہ منافقانہ عمل سے سوائے دشمنی اور نفرت کے کوئی اور چیز حاصل نہیں ہوتی۔ مسلمان

کے قول میں نرمی، محبت، سچائی اور درگذر کا جذبہ ہونا چاہیے تاکہ اس کا قول اس کے فعل سے مطابقت رکھے۔

سورۃ البقرہ(۲۶۳) میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"نیک بات کہنی اور درگذر سے کام کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری ہو اور اللہ تو بے نیاز اور بہت بردبار ہے۔"

اس آیت مبارکہ میں خیرات اور صدقہ کرنے سے بھی بہتر نرم اور نیک بات کو قرار دیا گیا ہے کیوں کہ خیرات اور صدقے سے تو کچھ لوگوں کا فائدہ ہوتا ہے لیکن نرم اور نیک بات سے قوموں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ البتہ نرم بات عورتوں کو اس وقت نہیں کرنا چاہیے جب کہ کسی نامحرم سے گفتگو کرنے کا موقع آجائے۔

سورۃ الاحزاب (۳۲) میں حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات تک کو نامحرم سے نرم بات کرنے کی ممانعت آئی ہے حالانکہ وہ امت اور مسلمانوں کی مائیں ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

"(اے میرے نبیؐ کی بیویوں) تم (نامحرموں) سے نرم (اور دبی) زبان میں گفتگو نہ کیا کرو ایسا کرو گی تو جس کے دل میں کسی طرح کا کھوٹ ہو تو وہ خدا جانے تم سے کس طرح کی توقعات پیدا کرے گا(پس) بات کرو تو معقول (اور بے لاگ)

پھر گفتگو کے آداب میں یہ بھی ہے کہ طول طویل اور لایعنی بات نہ کی جائے۔ فضول باتیں نہ ہوں فخرو مباہات کی باتیں نہ ہوں اور اپنی تعریف و توصیف نہ ہو۔"قول معروف" اسی بات کو کہتے ہیں جو فضول نہ ہو اور ہر لحاظ سے اچھی ہو۔ بعض حضرات لمبی لمبی تقریریں کرکے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں وہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اسلوب کلام میں اس لیے ادل بدل کرتا ہے کہ اس طرح وہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے تو اللہ تعالیٰ

قیامت کے دن اس کا فدیہ اور توبہ قبول نہ کرے گا۔

حضرت عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمایا:۔

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں گفتگو میں اختصار کروں کیوں کہ اختصار بہتر ہے۔"

طول طویل اور تکلیف آمیز بات حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمائی ہے۔ ارشاد ہے کہ:۔

"اللہ تعالیٰ ایسے بلیغ شخص کو مبغوض رکھتا ہے جو اپنی زبان کو اس طرح توڑتا موڑتا ہے جس طرح بیل اپنی زبان کو توڑ موڑ کر گھاس کھاتا ہے"۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں ہمارے لیے صرف قول لین، قول احسن، قول صادق، قول سدید، قول معروف، قول اعجاز کے لیے ارشاد ہے اس کے خلاف کوئی قول جائز نہیں۔

خودداری

(مطبوعہ ایجوکیشنل پریس پاکستان چوک کراچی۔ غالباً ۱۹۷۰ء)

اسلام سراپا خیر ہے اور اس نے حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد پر بہت زور دیا ہے۔ اہل قرابت، ہمسایہ، یتیم، بیوہ، محتاج، بیمار، غلام، مہمان، مسلمان بھائی عام انسان کے حقوق بلکہ جانوروں تک کے حقوق پہچاننا اسلام کی امتیازی خصوصیات میں سے ہے۔ بنی نوع انسان سے معاملہ کرنے میں جہاں حق اور صبر کی باہمی وصیت ضروری ہے وہیں ان کی جزئیات پر عمل کرنے کی تاکید کی ہے۔ ایک معاشرہ کس طرح صدق عمل کے بغیر کامیاب کہلایا جاسکتا ہے زبان کی سچائی، عمل کی سچائی، دیانت، امانت، رحم و ہمدردی، عدل و انصاف، تواضع، انکسار، ایثار واعتدال وغیرہ بکثرت فضائل اخلاق ہیں جن کے بغیر ایک صالح معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا۔ پھر عاجزی، انکساری اور دوستی ایسا وصف ہے کہ اس کے سامنے بڑی سے بڑی فرعونیت سر جھکادیتی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے

وعبادالرحمٰن الذین یمشون علی الارض۔۔ (پارہ ۱۹۔ سورہ فرقان)

"کہ ہمت والے (اللہ) کے (خاص) بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں اور جب جاہل لوگ ان سے باتیں کریں تو وہ ان کو سلام کریں"

بے رخی اور سخت کلامی کے ترک کرنے کا حکم بھی اسی لیے ہے کہ ہمارا نظام معاشرت صحیح اور صالح ہے۔ لیکن اسلام یہ بھی نہیں کہتا کہ ہماری فروتنی اور خاکساری اس حد تک ہو کہ ہمیں عزت نفس سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ قرآن پاک میں ۸۲ موقعوں پر اللہ تعالیٰ کا نام عزیز لیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عزت کے ساتھ ساتھ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے مومن بندوں کی عزت کے متعلق بھی اس طرح فرمایا ہے کہ:-

وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین ۔۔۔۔

"عزت تو اللہ کے لیے ہے اور اس کے رسولؐ کے لیے اور ایمان والوں کے لیے ہے' لیکن منافق نہیں جانتے۔" اس آیت میں اللہ نے مسلمان کو ایمان کی وہ عزت عطا فرمائی ہے جو کبھی چھینی نہ جائے گی۔ اس لیے مسلمان کا سر ہمیشہ باطل کے سامنے اونچا رہنا چاہئے اور خود کو اخلاق کا بہترین نمونہ پیش کر کے اپنی دینی خودداری کو برقرار رکھنا چاہئے۔ صلح حدیبیہ کے موقعہ پر جب کفار کے ساتھ صلح کی شرائط بظاہر کچھ دب کر ہوئیں اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اعتراض کرنے کی جراءت ہوئی تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بھی صحیح خودداری کی تعلیم دے رہے تھے۔

آپ نے فرمایا میں اللہ کا رسول ہوں اور اس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ حضرت عمرؓ کی نظریں جہاں تک کام کر رہی تھیں' حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اس سے بہت آگے تھی اور اس صلح کی جو مصلحتیں بعد میں ظاہر ہوئیں ان تک کسی اور کی کیا رسائی ہو سکتی تھی۔ کلمہ طیبہ بذات خود سب سے بڑی خودداری کی تعلیم کا سرچشمہ ہے یعنی اللہ کے سوا ہر طاقت اور ہر قوت کا انکار اپنی جگہ بہت عظیم تعلیم ہے اور اسے یہ تعلیم اس وقت سے دی جاتی ہے جبکہ وہ بولنا سیکھتا ہے' پھر لا حول ولا قوۃ الا باللہ یعنی کسی میں غلبہ اور قوت نہیں ہے۔ سوائے اللہ کے۔ یہ بھی اس کی خودداری اور عزت نفس کے لیے ایک لائحہ عمل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلمان جس کو یہ سکھلایا گیا ہے کہ وہ تمام مخلوقات سے اشرف و اعلیٰ ہے اور اللہ کے بعد ہی انسان کا درجہ ہے اور یہ انسان اللہ کا خلیفہ اور نائب ہے' اگر وہ اپنے اس منصب پر قائم رہتا ہے اور اپنے منصب کے مطابق عمل بھی پیش کرتا ہے تو اس کی سربلندی اور سرفرازی کا کوئی کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔ ایک واقعہ حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے' کسی شخص نے ان سے عرض کیا کہ لوگوں کا یہ گمان ہے کہ آپ میں غرور ہے

فرمایا غرور نہیں خودداری (اور عزت نفس) ہے یہ (اسلام) وہ عزت ہے جس کے ساتھ ذلت نہیں اور یہ وہ دولت ہے جس کے سامنے مفلسی نہیں' پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وللّٰہ العزۃ ولرسلہٖ وللمؤمنین...

"اور عزت تو اللہ کے لیے ہے اور اس کے رسولؐ کے لیے اور ایمان والوں کے لیے ہے۔"

خودداری اور وقار کے لیے نفسیاتی طور پر بھی شرافت کی ضرورت ہے اور شرافت کے لیے عفو و درگذر کی ضرورت پڑتی ہے۔ خودداری اور شریفانہ رکھ رکھاؤ کے لیے سنجیدگی متانت اور عالی ظرفی کی ضرورت پڑتی ہے اور ہروہ کام جس سے غرور و نمائش کا اظہار ہو گریز کرنا پڑتا ہے۔ اسی کے ساتھ کسی کی تحقیر اور تذلیل کا بھی کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ خود نماز جیسی چیز کے لیے وقار اور متانت کو ضروری قرار دیا گیا ہے' ارشاد ہے کہ:۔

"جب تم اقامت سنو تو نماز کے لیے سکون اور وقار کے ساتھ چلو' جلدی نہ کرو۔"

یہ ارشاد اسی لیے ہے کہ وقار قائم ہو۔ یہ نہ ہو کہ نماز کے لیے بے تحاشہ بھاگا جائے اور خواہ مخواہ عجلت اختیار کی جائے۔ جبکہ شریعت میں وسعت سے زیادہ مکلف نہیں کیا گیا۔

ادھر ادھر نہ دیکھنا بھی وقار اور عزت نفس کے لیے ہے۔ فقر و فاقہ کی حالت میں یا حرص و طمع کے موقع پر اگر خودداری پائی جائے تو ایسی صفت کو شریعت میں تعفف کہتے ہیں۔ اصحابؓ صفہ محتاج ضرور تھے لیکن وہ اپنے آپ کو سخت تکالیف میں مبتلا دیکھتے ہوئے بھی سوال نہیں کرتے تھے۔ اور اپنے حال کا اظہار بھی نہ ہونے دیتے تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:۔

اگر کوئی شخص لکڑی کا گٹھا پیٹھ پر لاد کر لائے اور اسے بیچ کر اپنی آبرو بچائے تو یہ

اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے سوال کرے۔ ایک موقع پر فرمایا کہ جب تک میرے پاس کچھ رہے گا، میں تم سے اسے بچا کر نہیں رکھوں گا۔ لیکن جو شخص اللہ سے یہ دعا مانگے کہ وہ اس کو سوال اور گداگری کی ذلت سے بچائے تو وہ اس کو بچا دیتا ہے اور جو شخص اللہ سے تمنا کا طالب ہوتا ہے وہ اس کو غنا عنایت فرماتا ہے اور جو صبر کرتا ہے اللہ اس کو صابر بنا دیتا ہے اور صبر سے بہتر اور وسیع تر دولت کسی کو نہیں دی گئی۔

ایک اور موقعہ پر ارشاد فرمایا کہ:۔

"یہ دولت سبز و شیریں ہے جو شخص استغنا کے ساتھ اس کو قبول کرتا ہے اس کو برکت حاصل ہوتی ہے اور جو حرص و طمع کے ساتھ اس کو حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اس سے محروم رہتا ہے اور اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جو کھاتا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا۔ اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔"

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے خودداری اور عزت نفس کی تعلیم کے لیے قوم کو بھی سبق دیے اور خود بھی عمل فرمایا۔ اپنے لیے اور اپنے خاندان والوں کے لیے زکوٰۃ اور صدقہ لینا سخت موجب ننگ قرار دیا۔

فقروفاقہ کی حالت میں عام لوگوں سے مدد چاہنا بھی خودداری کے منافی ہے۔ اسلام نے اس کی بھی مخالفت فرمائی ہے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:۔

"جو شخص محتاج ہو کر اپنی محتاجی کو لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے اس کی محتاجی دور نہیں ہوتی۔ لیکن جو شخص اسے اللہ کے سامنے پیش کرتا ہے ممکن ہے کہ اللہ اس کو بے نیاز بنا دے خواہ مرگ ناگہانی سے خواہ مال کے ذریعہ۔" اسی خودداری اور عزت نفس کو برقرار رکھنے کے لیے ایک مرتبہ فرمایا کہ:۔

"اگر تم کو سوال ہی کرنا پڑے تو صالحین سے سوال کرو۔"

صالحین کی یہ تخصیص اسی لیے ہے کہ ایسے لوگ باعزت طریقہ پر سوال کو پورا کریں

گے ورنہ نرمی سے رد کردیں گے۔

روز مرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی خودداری کے منافی بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً "کسی سے کہا جائے کہ ذرا وہ چیز اٹھادو۔ پانی اس گھڑے یا صراحی سے دیدو یا اور اسی قسم کے دوسرے کاموں کے لیے فرمائش کی جاتی ہے۔ حالانکہ ایسے کاموں میں بظاہر محتاجی کا اظہار نہیں ہے اور ایک شخص خود بھی ایسے کام آسانی سے کرسکتا ہے تو ایسے کاموں کی فرمائش سے بھی احتراز کرنا چاہیے کیونکہ یہ باتیں بھی کمال خودداری کے منافی ہیں۔ اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اسلام کے جس قدر منہیات ہیں وہ سب کے سب عزت نفس کو برقرار رکھنے کے لیے ہیں۔ جھوٹ، وعدہ خلافی، خیانت، بددیانتی، بہتان، چغلخوری غیبت، بدگوئی، بدگمانی، دورخاپن، مداحی، خوشامد، کنجوسی، حرص، بے ایمانی، چوری، ناپ تول میں کمی بیشی، رشوت، بغض و کینہ، خودبینی و خودنمائی وغیرہ جتنے رذائل ہیں وہ اسی لیے تو ممنوع قرار دیے گئے ہیں کہ ایک مسلمان ان میں مبتلا ہوکر خود کو رسوا نہ کرے اور اپنی خودداری کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔

مجالس خیر

(غیر مطبوعہ مضمون)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اقدس کا بیان جائز ہے۔ اسی ضمن میں میلاد شریف کی محفل میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور حالات وغیرہ بیان ہوتے ہیں۔ ان چیزوں کا ذکر احادیث میں بھی ہے اور قرآن مجید میں بھی۔ ایسے انعقاد ناجائز نہیں ہیں۔ اس محفل مبارک کے لیے دعوت نامے بھیجنا' شیرینی تقسیم کرنا سب جائز ہے۔ اگر شیرینی تقسیم نہ کی جائے تو کوئی ضروری چیز تو ہے نہیں۔ اور بوقت ذکر ولادت کھڑے ہوکر صلوٰۃ و سلام پڑھنا بھی جائز ہے۔ یہ نہیں سمجھا جاتا کہ اس موقع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ضرور تشریف لے آتے ہیں اس لیے کھڑے ہوکر صلوٰۃ و سلام پڑھا جاتا ہے۔ ویسے اگر وہ تشریف لے آئیں تو کوئی بعید بھی نہیں۔

غلط روایات اور من گھڑت باتیں بیان نہ کی جائیں۔ بزرگان دینؒ کی وفات کی تاریخ میں محفل منعقد کرنا اور ان کے حالات بیان کرنا بھی جائز ہے۔

رجب کی ۲۶ کو روزہ رکھنا اور ۲۷ کو روزہ رکھنا بھی جائز ہے لیکن ان کو ہزاری یا لکھی روزہ سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ شہدائے کربلاؓ کے صحیح حالات بیان کرنے کے لیے مجلس منعقد کرنا بھی جائز ہے لیکن بے سروپا باتیں جو مرثیوں میں ہیں وہ بیان نہ کی جائیں۔

زیارت قبور

(غیر مطبوعہ مضمون)

حدیث ۱۔ صحیح مسلم میں بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں نے تم کو (پہلے) زیارت قبور سے منع کیا تھا' اب تم

قبروں کی زیارت کرو اور میں نے تم کو قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ کھانے کی ممانعت کی تھی، اب جب تک تمہاری سمجھ میں آئے رکھ سکتے ہو۔

حدیث ۲۔ ابن ماجہؒ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تم کو زیارت قبور سے منع کیا تھا، اب تم قبروں کی زیارت کرو کہ وہ دنیا میں بے رغبتی کا سبب ہے اور آخرت یاد دلاتی ہے۔

حدیث ۳۔ صحیح مسلم میں بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو تعلیم دیتے تھے کہ جب قبروں کے پاس جائیں یہ کہیں۔

السلام علیکم أهل الدیار من المؤمنین والمسلمین وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون نسأل اللہ لنا ولکم العافیۃ

حدیث ۴۔ ترمذیؒ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مدینہ میں قبور کے پاس سے گزرے تو ادھر منہ کیا اور یہ فرمایا۔

السلام علیکم یا اهل القبور یغفر اللہ لنا ولکم انتم سلفنا و نحن بالاثر۔

حدیث ۵۔ بیہقی نے شعب الایمان میں محمد بن نعمانؒ سے مرسلاً روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اپنے والدین کی دونوں یا ایک کی ہر جمعہ میں زیارت کرے گا اس کی مغفرت ہو جائے گی اور نیکوکار لکھا جائے گا۔

حدیث ۶۔ خطیبؒ نے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی شخص ایسے کی قبر پر گزرے جسے دنیا میں پہچانتا تھا اور اُس پر سلام کرے تو وہ مردہ اُسے پہچانتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔

حدیث ۷۔ امام احمدؒ نے حضرت عایشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی، فرماتی ہیں، میں اپنے گھر میں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں (یعنی روضۂ اطہر میں) داخل ہوتی تو اپنے (زائد) کپڑے (جو غیروں کے سامنے ہونے میں پہنے جاتے ہیں) اتار دیتی کہ یہاں تو صرف میرے شوہر اور میرے والد ہیں۔ پھر جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں مدفون ہوئے تو حضرت عمرؓ کی حیا کی وجہ سے خدا کی قسم میں وہاں نہیں گئی، مگر اچھی طرح اپنے اُوپر کپڑوں کو لپیٹ کر۔

مسئلہ۔ جس کی قبر کی زیارت کو گیا ہے اس کی زندگی میں اگر اس کے پاس ملاقات کو آتا تو جتنا نزدیک یا دور ہوتا، اب بھی قبر کی زیارت میں اسی کا لحاظ رکھے۔ (عالمگیری)

مسئلہ۔ چار دن زیارت کے لیے بہتر ہیں۔ پیر، جمعرات، جمعہ اور ہفتہ۔ جمعہ کے دن نماز جمعہ کے بعد جانا افضل ہے اور ہفتہ کے دن طلوع آفتاب تک۔ اور جمعرات کو دن کے اول وقت میں اور بعض علماء نے فرمایا کہ پچھلے وقت میں افضل ہے۔ متبرک راتوں میں زیارت قبور افضل ہے۔ مثلاً "شب براءت۔ شب قدر۔ عیدین کے دن اور عشرہ ذی الحجہ میں بھی بہتر ہے (عالم گیری)۔

(یہ تمام احادیث و مسائل، بہار شریعت حصہ ۱۶ میں اور دوسری کتابوں میں تفصیل سے موجود ہیں)۔

اردو شاعری میں تصوف

(آہنگ یکم سے ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۸ء)

سورۃ آل عمران کی آیت ہے:-

لقد منّ اللہ علی المؤمنین اذبعث فی الامّتن۔ - -

ترجمہ۔ "اللہ پاک نے بے شک احسان کیا ایمان والوں پر کہ بھیجا ان میں رسولؐ انھیں میں سے، جو پڑھتا ہے ان پر آیتیں اس کی اور تزکیہ فرماتا ہے ان کا اور سکھاتا ہے ان کو کتاب اور حکمت، اور وہ لوگ تو پہلے صریح گمراہی میں تھے"۔

اس آیت مبارکہ سے واضح ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان خصوصیات میں سے ایک خصوصیت تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب ہے جس کے بغیر عملی زندگی بے معنی ہوجاتی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تزکیہ نفس کا کام ان کے نائبین نے انجام دیا، پھر صوفیہ کے مختلف سلسلے اسی مقصد کے لیے قائم ہوئے۔ دوسری صدی ہجری میں ابو ہاشم کوفی اور جابر بن حیان سب سے پہلے صوفی کہلائے جاتے ہیں۔ پھر تیسری صدی ہجری سے تصوف پر کتابیں بھی لکھی جانے لگیں اور ہمارے ملک میں حضرت داتا گنج بخشؒ (صاحب کشف المحجوب) سب سے پہلے تصوف کو علمی انداز پر پیش کرنے والے سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن حضرت بایزید بسطامیؒ (المتوفی ۲۶۱ھ) اور حضرت جنید بغدادیؒ (المتوفی ۲۹۷ھ) پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اپنے ذوق اور وجدان کی بناء پر مسئلہ وحدۃ الوجود کا ذکر کیا تھا۔ ان کے بعد محی الدین ابن عربیؒ (المتوفی ۶۳۸ھ) نے اس مسئلے کو ذہنی اور استدلالی جامہ پہنا کر ایک فلسفہ بنا دیا۔ لیکن اللہ پاک کا احسان ہے کہ اس نے امام غزالیؒ کو ابن عربی سے پہلے ہی اس خدمت پر مامور کر دیا تھا کہ وہ اسلامی عقائد کو صحیح اور اصلی صورت میں پیش کرکے تصوف کو فلسفے سے الگ رکھیں۔ چنانچہ بعد کے فارسی اور اردو شعراء نے بزرگان دین کے مسلک کو قائم رکھتے ہوئے یہی رویہ

اختیار کیا اور تصوف کو فلسفہ ہونے سے بچایا۔ تاہم جن بزرگوں نے مسئلہ وحدۃ الوجود میں غلو کیا تھا ان کی اصلاح کے لیے حضرت مجددالف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ وحدۃ الشہود پر زور دیا یعنی مخلوق، خالق سے ہے لیکن وہ خالق نہیں کہلائی جاسکتی۔

اردو کے سب سے پہلے باکمال صوفی شاعر ولیؔ (المتوفی ۱۱۱۹ھ) تھے، جو حضرت مجددالف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے پرپوتے علی رضاؒ سے بیعت تھے۔ انہوں نے باقاعدہ اور بکثرت متصوفانہ اشعار لکھے ہیں۔ مثلاً":۔

مسند گلُ منزلِ شبنم ہوئی   دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

ہُوا نئیں جب تلک خالی اپُس سوں   گرفتاراں میں ہرگز معتبر نئیں

ولیؔ کے بعد سراج اورنگ آبادی نے ایسے اشعار بکثرت لکھے ہیں۔ ان کی ایک متصوفانہ اور مشہور غزل اس طرح شروع ہوتی ہے:

خبر تحیرِ عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی

نہ تو تو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی تو بے خبری رہی

پھر حضرت مظہرجان جاناں نے فارسی اور اردو میں متصوفانہ کلام لکھا مثلاً"

گزرِ گئے دین اور دنیا سے رتس پر   ترا گھراور کئی منزل رہا ہے

میرا جلتا ہے دل اس بلبلِ بے کس کی غربت پر

کہ گل کے آسرے پر جس نے چھوڑا آشیاں اپنا

حضرت مظہرؒ کے شاگردوں میں یقینؔ، تاباںؔ، حزیںؔ، بیاںؔ وغیرہ نے اسی رنگ کو قائم رکھا۔ پھر خواجہ میردردؔ کی تمام و کمال شاعری اسی رنگ میں ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ خواجہ میردردؔ، شہودی مسلک رکھنے کے باوجود شاعرانہ روایات کو قائم رکھتے ہوئے ہمیشہ اپنی شاعری میں وجودی مسلک کو اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً"

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا   [illegible] آیا نظر [illegible]

حجاب رخ یار تھے آپ ہی ہم کھلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ دیکھا

دردؔ کے معاصرین اور متعاقبین میں بہت سے شعراء نے تصوف کے مضامین نظم کیے ہیں لیکن وہ محض رسمیہ معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ مرزا جعفر علی حسرت نے بھی کئی غزلیں متصوفانہ لکھی ہیں اور ان میں بڑا درد ہے' ایک غزل میں کہتے ہیں:

شبنم کی مثال اس چمن میں شب آئے تھے ہم' سحر گئے ہم

کل روتے ہوئے جو اتفاقاً" حسرت کے مزار پر گئے ہم

پڑھتا تھا یہ شعر وہ تہِ خاک بس سنتے ہی جس کے مر گئے ہم

واماندوں پہ دیکھئے کہ کیا ہو اپنا تو نباہ کر گئے ہم

پھر نظیرؔ اکبر آبادی کے یہاں دنیا کی بے ثباتی سے متعلق بکثرت اشعار ہیں:

ع سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ان کی مشہور نظم ہے۔ مسئلہ وحدۃ الوجود پر بھی۔ مثلاً":۔

تنہا نہ اسے اپنے دل تنگ میں پہچان ہر باغ میں ہر دشت میں ہر سنگ میں پہچان

ان کے بعد بہادر شاہ ظفر خصوصیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی بے بسی اور بے کسی کے عالم میں کیا کیا لکھتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

جس کو کہ ڈھونڈتا ہوا میں ہر کہیں گیا

دل ہی میں تھا مرے وہ مجھے مل یہیں گیا

عالم صورت میں تو میں صورت آدم میں ہوں

عالم معنی میں لیکن اور ہی عالم میں ہوں

کہیں میں غنچہ ہوں' واشد سے اپنے خود پریشاں ہوں

کہیں گوہر ہوں' اپنی موج میں میں آپ غلطاں ہوں

غالبؔ اور آتشؔ کے یہاں بھی ایسے مضامین ملتے ہیں۔ پھر امیرؔ مینائی جیسے صوفی

شاعر کا زمانہ آتا ہے' انھوں نے بکثرت متصوفانہ اشعار لکھے ہیں۔ مثلاً":

کونین میں ہے جلوہ حسن جمال دوست ہے ایک روشنی کہ ادھر بھی ادھر بھی ہے

بیگانہ ہو کے سارے جہاں سے جدا ہوا اے عالم آشنا جو ترا آشنا ہوا

غافل نزول ہی تو کمال عروج ہے خاک فنا ہی منزل آب بقا ہوئی

پھر محسن کاکوروی جو شروع ہی سے صوفی گھرانے کے زیر تربیت رہے تھے۔ فنافی الرسولؐ کی نعمت، عظمیٰ سے سرفراز ہوئے۔ ان کے پورے کلام میں اسی عشق کی سرشاریاں نظر آتی ہیں۔ وہ مثنوی صبح تجلی میں کہتے ہیں:۔

سالک ہے چمن میں نہر موزوں مجذوب ہے شاخ بید مجنوں

ہے صوفی صاف دل صنوبر تحریک نسیم' حالت آور

ہر سم بہ خلوت آرمیدہ ہر ایک ثمر خدا رسیدہ

اسی طرح کی مصطلحات سے محسن کاکوروی کا کلام معمور و مشہور ہے پھر اسمٰعیل میرٹھی کا زمانہ آتا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

بزم ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں

ہے یہ تیری ہی صدا غیر کی آواز نہیں

حجاب شاہد مطلق نہ اٹھا ہے نہ اٹھے گا

جسے ہم لامکاں سمجھے تھے وہ بھی اک مکاں نکلا

اسمٰعیل کے معاصر لیکن بہت بڑے عالم اور عاشق رسولؐ یعنی مولانا احمد رضا خان بریلویؒ نے نعت کے علاوہ تصوف پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ ایک غزل محاسبہ نفس پر اس طرح شروع ہوتی ہے:۔

سونا جنگل' رات اندھیری' چھائی بدلی کالی ہے

سونے والو' جاگتے رہیو' چوروں کی رکھوالی ہے

آنکھ سے کاجل صاف اڑالیں یاں وہ چور بلا کے ہیں

تیری گٹھری تاکی ہے اور تو نے نیند نکالی ہے

سوناپاس ہے' سونا بن ہے' سونا زہر ہے اٹھ پیارے

تو کہتا ہے نیند ہے پیاری' میری مت ہی نرالی ہے

پھر بے نظیر شاہ وارثی نے اکثر کلام نظریہ وحدۃ الوجود کے ابلاغ کے لیے لکھا ہے۔ ایک غزل اس طرح شروع ہوتی ہے:۔

ازل جس بے نشاں کا نام ہے اس کانشاں میں ہوں

نہاں خانے سے جو نکلا ہے وہ جلوہ عیاں میں ہوں

اصغر گونڈوی حضرت شاہ عبدالغنی منگلوریؒ سے بیعت تھے اس لیے ان کے کلام میں اکثر تصوف ہے وہ کہتے ہیں:۔

کارفرما ہے فقط حسن کا نیرنگ کمال چاہے وہ شمع بنے چاہے وہ پروانہ بنے

اصغر حریم عشق میں ہستی ہی جرم ہے رکھنا کبھی نہ پاؤں یہاں سر لیے ہوئے

پھر علامہ اقبال کا زمانہ آتا ہے۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میرا تو عقیدہ ہے کہ غلو فی الزہد اور مسئلہ وجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ خواجہ نقشبندؒ اور مجدد سرہندیؒ کی میرے دل میں بہت عزت ہے۔ مگر افسوس کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے' جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں"۔

علامہ اقبال اسی لیے نفی خودی کے نہیں بلکہ اثبات خودی کے قائل ہیں۔ جگہ جگہ وہ فرماتے ہیں:۔

دمادم رواں ہے یم زندگی ہر اک شے سے پیدا رم زندگی

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

علامہ اقبال کے معاصر فانی بدایونی اکثر تصوف کے اشعار لکھتے تھے۔ مثلاً"

صور و منصور و طور ارے توبہ ایک ہے تیری بات کا انداز

اس کی ہستی سے جدا میرا وجود اللہ رے بیم

بلبلہ ہے عین دریا، پھر بھی دامن چیدہ ہے

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

متاخرین میں خواجہ عزیزالحسن مجذوب، حسرت موہانی، درد کاکوروی، وغیرہ بکثرت شعراء ایسے ہوئے ہیں جو حقیقت میں صوفی بھی تھے اور بلند پایہ شاعر بھی۔ دیکھیے یہ سلسلہ کب تک اور کس طرح قائم رہتا ہے۔ بقول عرفی۔

ع ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی ست

حضرت شیخ عثمانؒ کا رسالہ عشقیہ

(الرحیم۔ حیدر آباد۔ نومبر ۱۹۶۷ء)

ہالانی (ضلع نواب شاہ۔ سندھ) میں محترم مولوی عبدالصمد صاحب کے پاس ایک قلمی نسخہ موسومہ عشقیہ موجود ہے جس میں دوسوانتیس اوراق ہیں اور خاتمے کی یہ عبارت ہے:۔

"تمت الکتاب بعون اللّٰہ الملک الوہاب نسخہ عشقیہ من تصنیف سید عثمان مروندی قدس اللّٰہ سرہ العزیز۔ روزشنبہ بوقت یک نیم پاس۔ بتاریخ نہم شعبان ۵۹۱ ھ۔ کاتب الحروف بندہ قادر بخش قادری خاک پاے عالمان و فقیران غفراللّٰہ لہ ولوالدیہ والاستاذی والجمیع المومنین والمومنات والمسلمین والمسلمات یاارحم الراحمین۔۔۔"

اس عبارت سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ حضرت عثمان مروندی (لعل شہباز قلندر سہوانی) رحمہ اللہ علیہ کا ہوگا جن کی عمر قریب ایک سو سال بتائی جاتی ہے اور جن کا سال وفات ۶۷۳ھ ہے لیکن اس عبارت میں جو ۵۹۱ھ درج ہوا ہے اس کو بغور دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں تحریف کی گئی ہے اور اس پر بعد میں قلم پھیرا گیا ہے۔ پھر جو یہ کہا گیا ہے کہ ۵۹۱ھ کی نویں شعبان کو شنبہ تھا، تو یہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ اس سال اس تاریخ کو شنبہ نہیں، چہارشنبہ تھا (۱۹ جولائی ۱۱۹۵ء)۔ پھر کتاب کی داخلی شہادتوں سے کتاب اور مصنف دونوں کے زمانے کی تعیین میں مدد ملتی ہے۔ چناں چہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایسی شہادتیں پیش کردی جائیں۔

کتاب کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العٰلمین والصلوٰۃ علیٰ رسولہ محمد وّ اٰلہ اجمعین

سبحان اللہ قادرے کہ خاک را از لطف عمیم جان بخشید و بہ تشریف ولقد کرمنا بنی آدم مشرف گردانید و بخلوت یحبہم و یحبونہ معزز ساخت و بدولت وصال وھو معکم بنواخت وفی انفسکم افلا تبصرون اشارے است باختصاص و نحن اقرب الیہ من حبل الورید کرامتے ست خاص۔ فاذکرونی اذکرکم نغمہ ایست یگانہ نواز وصلاے دعوتے استجب لکم نعمتے ست بابرکت و ساز صلوٰۃ اللّٰہ من الازل الی الابد علی افضل العالم دوام احمد محمد کہ تجلی نخستین اوّل ما خلق اللّٰہ نورے است و بر آل واصحاب او کہ بایھم اقتدیتم اھتدیتم ہریک وسیلہ قرب از دوری رضوان اللّٰہ علیھم اجمعین۔

امابعد۔ چوں دریں جہاں لطف الٰہی و فضل نامتناہی مر بندہ را توفیق طلب بخشد و درمحبت خود بخود کشد در دل او مہر و دوستی خود انداز و تا درذکر و بندگی شتابد و ہدایت یابد و کسے راکہ گمراہ کند، محبت دنیاے تباہ، مشغول کند و محجوب باسباب دنیوی در آرد کہ یضل بہ کثیرا" ویھدی بہ کثیرا" کنیل مصرماء للمحبوبین و بلاء للمحجوبین۔

نیل مصری خود بقبطی خون نمود قوم موسیٰ را نہ خون بود آب بود

بیت

آں راکہ تو رہبری کنی کسے گم نہ کند واں را تو گم کنی کشش رہبر نیست

زہے لطف کمال کہ خاک صلصال را تاج شرافت انی جاعل فی الارض خلیفہ بر فرق نہاد و فرزندان خلف او را در ولایت الاان اولیائی تحت قبائی تصرف داد و راہ روان دین را بشرف قرب محض بکاس محبت از ماسوای پرداخت۔ خصوصا" حضرت غوث الثقلین کہ درطی مسالک سلوک و احیاے مراسم دینی و ایجاد شواہد یقینی بنہایت رسانیدہ محی الدین شد و در طریق وصول از فناے تقید عبودیت ببقائے قدرت مطلق پیوستہ عبدالقادر شد و خواجہ زمان و زمین، رفیع قدر و دوربین، صاحب دولت و دین خواجہ بہاء الدین کہ بانفاس متبرکہ و برہان مبرہن و بیمن نظر روشن، توجہ شریفش در دلہائے نقش حق می بست

بیت

خواجہ کش جہاں غلام شدہ   او خود از بندگیش دارد عار

و ارشاد پناہی مظہر جلال ذوالجلال حضرت شیخ جلالؒ کہ خلیفہ حضرت غوث الثقلین رحمۃ اللہ علیہ است قدس اللہ سرہ و نخست ارادت فقیر بسلسلہ قادریہ بوسیلہ بیعت مبارکش بود و بحکم اشارت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ و اجازت غوث الثقلین رحمۃ اللہ علیہ ۔ ۔ نقشبندیہ از خدمت خواجہ اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ یافتہ کہ بحق و خود فانی و قرب حیات جاودانی مخلصاں را از صحبت ایشاں حاصل می شد و چوں شرف ملازمت حضرت پیرولی برکی رحمۃ اللہ علیہ میسر شد از کمال ولایت و محض کرامت سہ روز توجہ بحال بندہ فرمودند و ۔ ۔ نمودند کہ سالہا بل قرنہا زبان تقریر و خامہ تحریر و در ادائے شکر آں عاجز و قاصر است و دور باقی از فیض ساقی یعنی نشاہ از خدمت حضرت خواجہ باقی رحمۃ اللہ علیہ نصیب شد۔ خادم۔ ۔ عثمان کہ ریزہ چیں خوان اخوان الصفائیست بلکہ خاک جرعہ نوش بزم خمر الوفاء ۔ ۔ وللارض من کأس الکرام نصیب ہمیشہ دریوزہ استمداد از در دلہا نمودہ ۔ ۔ دستگیری از پاے مردے مردان کردہ و در جست و جوئے ایں دولت و تک و پوی ایں سعادت از خاک اقدام وارستگان ننگ و نام، کحل الجواہر ہر دیدہ دیدہ۔ ۔ بر وفق مقال و حسب حال است۔

دولت فقر خدایا من ارزانی دار   کین کرامت سبب حشمت تمکین من است

اے درویش تا بر چہار آتش گداختہ نہ گردی پختہ نشوی۔ اول آتش فقر۔ دوم آتش محبت۔ سوم آتش دم نہ زدن در قضاء قدر یعنی تسلیم۔ چہارم آتش از غم روزی بے غم بودن یعنی توکل ۔ اے درویش تا ازیں چہار عقبہ در نگزری ترا عاشق نخوانند۔ و ایں تحفۃ القلوب و ہدیۃ الارواح بچہار مفصل شد و ہر فصل بچہار باب منسوب گشتہ و ہر

باب بکلام ربانی و حدیث مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم و سخنان اہل اللہ کشائش یافت تا دوستان لائق و عاشقان صادق ازیں بہرہ برگیرند و باغیر مشغول شدن راحت نپزیوند کہ لا وحشۃ مع اللہ ولاراحۃ مع غیر اللہ۔ ایں رسالہ مسمیٰ بعشقیہ دریاے معرفت شد تا عاشق را الفتے باشد۔

یہ طویل اقتباس ضرورتاً پیش کیا گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

۱۔ مصنف پہلے حضرت شیخ جلال(۱) (تھانیسری۔ المتوفی ۹۸۹ھ) سے بیعت ہوئے تھے جو حضرت عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۹۴۴ھ) کے خلیفہ تھے۔ یعنی مصنف نے پہلے قادری سلسلے میں ارادت حاصل کی تھی۔

۲۔ اس کے بعد حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے "اشارہ" (روحانی) اور حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی "اجازت" (روحانی) سے خواجہ اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ (۲) کی خدمت میں نقشبندی طریقہ اختیار کیا۔

۳۔ پھر حضرت پیرولی برکی علیہ الرحمہ سے صرف تین دن کی صحبت میں ولایت کے کمالات کے عجیب عجیب مشاہدات ہوئے۔

۴۔ ان بزرگوں کے بعد حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۰۱۲ھ) کی۔

---

(۱)۔ خزینۃ الاصفیاء۔ جلد اول (صفحہ ۴۴۰۔ طبع لکھنؤ) میں کتاب کے مولف غلام سرور لاہوری نے حضرت جلال تھانیسری کی تاریخ یوں لکھی ہے:۔

جلال از جہاں چوں بجنت رسید	پئے سال ترحیل آں ذی کمال
یکے "شیخ پاکیزہ دل" شد عیاں	دگر ہست "مہتاب عزت جلال"
۹۸۹ھ	۹۸۹ھ

(۲)۔ ممکن ہے کہ یہ اسحاق " حضرت ہاشم کشمی (صاحب زبدۃ المقامات) کے بھائی ہوں جن کے انتقال پر حضرت ہاشمؒ کا مرثیہ ان کے دیوان میں موجود ہے۔

خدمت میں شرف باریابی حاصل ہوا۔

۵۔ مصنف نے اپنے اس رسالے کا نام "عشقیہ" رکھا تھا اور یہ کہ اس رسالے میں چار فصلیں ہیں اور ہر فصل میں چار باب ہیں۔

ان فصلوں کی تفصیل اس طرح آتی ہے کہ پہلی فصل میں فقر، تسلیم توکل اور ذکر کے چار ابواب ہیں۔ دوسری فصل میں بھی چار ابواب (۱) سلوک کی انتہا (۲) درویشوں کی عادات (۳) اہل اللہ کی ریاضت اور (۴) رضائے الٰہی کے تحمل سے متعلق ہیں۔ تیسری فصل میں بھی اسی طرح چار ابواب ہیں:

(۱) خاموشی اور گوشہ نشینی (۲) ذوق و محبت (۳) شوق اور (۴) تواضع۔ یہ فصل طویل مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد آخری یعنی چوتھی فصل ہوتی ہے جس میں حسب معمول چار ابواب ہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) تضرع (۲) عاشقوں کی جاں بازی (۳) نصیحت، دلجوئی، عیب پوشی وغیرہ اور (۴) عاشقوں کے حالات اور خاتمہ کتاب ہے۔

ان تمام فصلوں میں جگہ جگہ علماء، صلحاء اور صوفیہ کے اقوال یا اشعار ہیں۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے علاوہ ان بزرگوں کا ذکر آتا ہے:

عبداللہ سری سقطی (م ۲۵۳ھ۔ ۷ الف)۔ شیخ جنید بغدادی (م ۳۰۲ھ۔ ۶۱ ب)۔ حسین حلاج (م ۳۰۹ھ ۔ ۵۶ الف۔ ۵۴ الف)۔ شیخ ابو علی دقاق (م ۴۰۵ھ ۔ ۶۲ ب)۔ ابو سعید ابوالخیر (م ۴۴۰ھ۔ ۴۹ ب)۔ عبداللہ انصاری (م ۴۸۱ھ۔ ۶۲ ب۔ ۴۳ ب)۔ خواجہ یوسف ہمدانی (م ۵۳۵ھ۔ ۶۲ ب)۔ احمد جامی (م ۵۳۶ھ۔ ۵۵ ب)۔ عبدالقادر جیلانی (م ۵۶۱ھ۔ ۳ الف۔ ۱۲ ب)۔ خواجہ معین الدین چشتی (م ۶۳۳ھ۔ ۱۲ ب)۔ سعدی (م ۶۹۱ھ۔ ۵ الف۔ ۵ ب)۔ جلال الدین رومی (م ۶۷۲ھ۔ ۳۶ الف۔ ۲۸ ب۔ ۶۳ الف)۔ سیف الدین

باخرزی (م ۶۵۸ ھ۔ ۱۰۵ الف)۔ عراقی (م ۶۸۸ ھ۔ ۹۰ الف)۔ بہاء الدین نقشبند بخاری (م ۷۹۱ ھ۔ ۳ الف۔ ۲۸ ب۔ ۸۴ ب)۔ حافظ شیرازی (م ۷۹۲ ھ۔ ۳۵ ب۔ ۴۴ ب۔ ۵۸ الف۔ ۶۸ الف۔ ۱۰۱ الف۔ ۱۱۴ الف)۔ شرف الدین یحییٰ منیری (م ۷۸۲ ھ۔ ۱۲۴ الف)۔خواجہ محمد پارسا (م ۸۲۲ ھ۔ ۱۹ الف۔ ۶۲ ب)۔ زین الدین خوافی (م ۸۳۸ ھ۔ ۶۳ الف)۔ عبیداللہ احرار (م ۸۹۵ ھ۔ ۵۷ ب)۔ عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۴ ھ۔ ۱۱۹ الف)۔ خواجہ باقی باللہ (م ۱۰۱۲ ھ۔ ۲ ب)۔ رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے بکثرت بزرگوں کے اقوال ،احوال یا اشعار درج ہیں۔ خود شیخ عثمان علیہ الرحمہ (ا) (مصنف) نے اپنے اشعار یا غزلیں کثیر تعداد میں نقل کی ہیں۔ مثلاً یہ اوراق ہیں :۔

۳ الف۔ ۱۵ الف۔ ۱۶ الف ۔ ۱۹ الف۔ ۲۱ ب۔ ۳۴ ب۔ ۳۸ الف۔ ۵۱ الف۔ ۶۴ الف۔ ۶۹ ب۔ ۷۰ ب۔ ۷۳ ب۔ ۸۵ ب۔ ۹۶ ب۔ ۱۱۷ ب۔ ۱۳۲ الف۔ ۱۶۱ ب۔ ۱۸۱ الف۔ ۱۸۲ ب۔ ۱۸۸ الف۔ ۱۹۶ ب۔ ۲۰۰ ب۔ ۲۱۲ الف۔ ۲۱۳ ب۔ ۲۲۱ الف۔ •

شیخ عثمان علیہ الرحمہ کی ایک غزل (الف) ملاحظہ ہو۔

اے دِر عیاں نہاں و نہاں در عیاں توئی   بے مثل و لامثال نشاں ۔بے نشاں توئی
توآں نۂ کہ کس زتو یابد یکے نشاں   اے برتراز بلند و بلند از گماں توئی
در ظاہرا ترا طلبم و آ نکی نہاں   درچوں نہاں بچو نمت آنکہ عیاں توئی
در دہر و دور گردش عالم، جہان و خلق   غائب میان ہر ہمہ و باہماں توئی
ہر رو بروے ظاہرو ہر سو بسو نہاں   معلوم شد چناں کہ ہمیں و ہماں توئی
بودیم درپئے تو بہر سو بجست وجوی   عثماں طلسم بود جمال جہاں توئی

مصنف کی شاعری کا عام رنگ یہی ہے اور غالباً ان کا کوئی اور موضوع نہیں۔

(ا)۔ رسالہ عشقیہ کے مالک مولوی عبدالصمد صاحب کے پاس شیخ عثمانؒ کا دیوان قلمی بھی موجود ہے۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے کے زمانے کی تعیین کی جائے۔ انڈیا آفس لندن کا مخطوطہ نمبر ۲۹۱۵ بھی اسی رسالے کا دوسرا نسخہ ہے جو محمد شاہی جلوس کے

اکیسویں سال یعنی ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں لکھا گیا تھا۔HERMMANN ETHE کا خیال ہے کہ اس کے مصنف "شاہ عثمان" وہی ہیں جن کا انتقال ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۷ء سے متعلق حضرت ہاشم کشمی(ا) علیہ الرحمہ نے اپنے دیوان (مخطوطہ نمبر ۲۸۹۸۔ انڈیا آفس۔ لندن) میں قطعہ تاریخ لکھا تھا۔ لیکن رسالہ عشقیہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ عثمان نہیں ہیں جن کا انتقال ۱۰۰۵ھ میں ہوا تھا بلکہ یہ موخر ہیں۔ کیوں کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۰۱۲ھ) سے استفادہ کیا تھا اور رسالے میں ایک ریختہ (ب) اس طرح آتا ہے:۔

دلا غافل چہ می خسپی کہ اپنی سیج تھیں ڈریے چو روزے مرگ در پیش است اتنی نیند کیوں کریے
چو دزد اندر کمیں باشد کرے جو نیند بنجارا نہ باشد سود یک حبہ گواوے مول بھی سارا
دریں دنیاے دہ روزے بڈائی کائیں کون کریے اگر صد سال شد عمرت نہایت ایک دن مریے
چہ مغروری دریں دنیا سدا اس جگ میں نا رہنا ہمیں راہے کہ در پیش سبھی اس پنتھ ہے چلنا
کجا رفتند آں شاہاں کہ جن کے بار تھے ہستی گرفتند جائے در صحرا گئے سب چھوڑ کر بستی
کجا رفتند آں مرداں کہ بانکی ٹوپیاں دھرتے ہمہ در خاک خسپیدند جن سیں سیہ بھی ڈرتے
کجا رفتند آں یاراں جنہاں تھے جیونی تیرا چناں رفتند زیں عالم کیا نہ پھر کدی پھیرا
کجا رفتند آں خوباں جنھوں کے نین تھے بانکے چناں بگزاشتند خانہ نہ پھر گھر بار دھر جھانکے

(ا)۔ یہ ہاشم کشمیؒ وہی بزرگ ہیں جو حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے خلیفہ اور زبدۃ المقامات (برکات احمدی) کے مصنف ہیں۔ ان کی ایک اور تصنیف "نسمات القدس من حدیقۃ الانس" قلمی ہے جو مدینہ طیبہ کے مکتبہ عارف حکمت میں محفوظ ہے۔ اس کتاب میں نقشبندیہ سلسلے کے ان بزرگوں کا ذکر ہے جو حضرت خواجہ باقی باللہ رحمہ اللہ علیہ سے پہلے ہوئے ہیں۔

کجا آں ماہ رو خوباں چو مور کندا وتے پاتی نہ نام و نے نشاں ماندہ سبھی گل گل بھئے ماٹی
کجا سوداگراں منعم جنہاں کے بار تھے ناندھے کلالاں خاک شاں بردند گھڑے کمہار بھانڈے
کجا آں زیب و آں زینت کہاں اوہ روپ اوہ ریکھا ہمہ رفتند از دنیا بھیا اس جگت کا لیکھا

در آں وقتے کہ تو میری نہ دنیا کام تجھ آوے   کسے کو داد بخشیدہ وہ کچھ ساتھ پھر جاوے
نہ آنجاں خویش کس باشد نہ کرسی یار کو یاری   نہ کس مونس بود دیگر نہ بھائی باپ مہتاری
ترا در گور ۔سپارند پھر کر لوگ گھر آوے   بیفتد باخدا کارے نہ کوئی آوے چھرکاوے
در آں درگاہ بے رشوت نہ جانوں کیوں رہے پردا   جنیدا مرد آں باشد کہ اس سنسار تھیں ڈردا

یہ شیخ جنیدؒ وہی ہیں جن کا ذکر حافظ محمود شیرانی مرحوم نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں کیا ہے۔(۱) اور ان کا مذکورہ بالا ریختہ بھی نقل کیا ہے۔ نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ گیارھویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں۔ پھر اس کتاب (صفحہ ۲۳۲)میں حافظ مرحوم نے شیخ عثمان جالندھری کا ذکر کیا ہے کہ وہ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ (م ۱۰۳۴ھ) کے پیر بھائی تھے اور ان کا ایک ریختہ یہ بھی نقل کیا ہے:۔

عاشق دیوانہ ام آؤ پیارے حبیب   از ہمہ بیگانہ ام آؤ پیارے حبیب
اے نظرت آفتاب بر من مسکیں بتاب   جان و جگر شد کباب آؤ پیارے حبیب
اے دل وائے جان من درد تو درمان من   ذکر تو سامان من آؤ پیارے حبیب
زاں لب شیریں شکر بار تو در و گہر   ساز مرا بہرہ ور آؤ پیارے حبیب
چند کشی کشتہ را عاشق آشفتہ را   بے دلم و بے نوا آؤ پیارے حبیب
دمبدم انتظار یک   نظرم واگمار   عاشقم و خستہ وار آؤ پیارے حبیب
اے تو کس بے کساں مونس بے چارگاں   غم خور آوارگاں آؤ پیارے حبیب

(۱)۔ پہلا ایڈیشن۔ صفحہ ۲۳۴(مطبوعہ لاہور ۱۹۲۸ء)

حکم ترا بندہ ام نزد تو شرمندہ ام   زار و سرافگندہ ام آؤ پیارے حبیب
وقت شبانم گزشت کار نیامد زدست   پشت ز غمہا شکست آؤ پیارے حبیب
دربدر و کوبکو نعرہ زناں سوبسو   دیدن تست آرزو آؤ پیارے حبیب
روز و شبم انتظار دمبدم بے قرار   دیدہ چو ابر بہار آؤ پیارے حبیب

بدل عثماں غریب رحمت خود کن قریب ٭ زانکہ تو ہستی مجیب آؤ پیارے حبیب

یہی ریختہ کچھ فرق کے ساتھ ہمارے مخطوطہ میں (ق الف ۱۸۸) بھی موجود(۱) ہے' اس لیے کلی طور پر ثابت ہوجاتا ہے کہ رسالہ جو غلطی سے حضرت عثمان مروندی(لعل شہباز قلندر) رحمہ اللہ علیہ سے منسوب کردیا گیا ہے' صحیح نہیں' بلکہ اس کے مصنف حضرت شیخ عثمان جالندھری علیہ الرحمہ ہیں۔(۲)

---

(۱)۔ مخطوطے میں (ب - الف) کچھ ہندی دوہرے بھی نقل کیے گئے۔

(۲)۔ شیخ عثمان جالندھریؒ کے "چہل مکتوبات" "نور" "تفسیر سورہ رحمٰن" وغیرہ کئی غیر مطبوعہ رسالے پنجاب کے بعض ذاتی کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

سفر کابل اور بعض تبرکات

(ماخوذ۔ تحقیق، شمارہ ہشتم ۱۹۹۳ء۔ سندھ یونی ورسٹی حیدر آباد)

حیدر آباد سے ہم پانچ افراد راولپنڈی اور اسلام آباد ہوتے ہوئے پشاور پہنچے۔ حاجی علیم الدین صاحب، احمد علی میمن صاحب، ڈاکٹر حبیب اللہ صاحب اور بچل شاہ صاحب ہم سفر تھے۔ جمعہ ۲۲ اگست ۱۹۶۹ء کو قریب ۲ بجے سہ پہر میں افغان ایرلائن کا ڈکوٹا جہاز ملا۔ اس کا کرایہ پشاور سے کابل کا ۷۳ روپے تھا اور واپسی کا ۱۳۹ روپے تھا۔ لیکن اگر ایک ہفتے میں واپسی ہوجائے تو وہاں سے ۹۷ روپے ہوتا تھا۔ قریب ۴۰ منٹ میں سفر طے ہوا۔ کابل میں جمیل ہوٹل میں قیام کیا۔ اس زمانے میں پاکستانی ایک روپے کے دس افغانی روپے ملا کرتے تھے لیکن ہم لوگ جب وہاں پہنچے تو ساڑھے آٹھ روپے افغانی ملے بلکہ جشن کابل کے موقع پر (جو ۲۳ اگست سے دس دن تک منایا جاتا تھا) ساڑھے سات افغانی ہوگئے۔

کابل میں پرانا قبرستان شہر سے قریب ۳ میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں دو صحابیوں کے مزار ہیں۔ یعنی حضرت تمیم عدوی رضی اللہ عنہ اور حضرت جبیر انصاری رضی اللہ عنہ۔ دونوں مزار ساتھ ساتھ ہیں اور ہلکے سبز سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں ظاہر شاہ حکمران تھے۔ ان کے والد نادر شاہ نے وہ مزار تعمیر کرائے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ۴۴ھ میں یہ دونوں صحابی وہاں تبلیغ کے لیے تشریف لائے تھے اور شہید ہوگئے تھے۔ جمیل ہوٹل سے جہاں ہم لوگ ٹھہرے تھے، قریب دو فرلانگ پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے پوتے لیث بن قیسؒ کا مزار ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ ان کے پوتے نہیں، بلکہ افغانوں (یا پٹھانوں) کے جد اعلیٰ تھے جو وہاں پہلے مسلمان ہوئے تھے اور ۸۱ھ میں شہید ہوئے تھے۔ ان کو یہاں "فاتح ثانی" اور "شاہ دو شمشیر" کہا جاتا ہے کہ وہ دونوں ہاتھوں میں تلوار لے کر کفار سے جہاد کرتے رہے، پھر شہید ہوئے۔ حضرت

عاشقین یا عارفین دو بزرگوں کے مزار بھی کچھ فاصلے پر ہیں۔ کہاجاتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ قادری سلسلے کے تھے۔ محلہ سیاہ سنگ میں حضرت عزت اللہ مجددی علیہ الرحمہ کا مزار ہے یہ حضرت خواجہ محمد معصوم ثانی علیہ الرحمہ کے صاحبزادے ہیں۔ دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۲۴۹ھ کو ان کا وصال ہوا تھا۔ ان کا سجع تھا۔

ع یا مجدد، عزت اللہ از تو عزت یافتہ

کابل ندی بیچ شہر سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے کنارے پر تیمور کے خاندان والوں کے مزارات ہیں۔ اور ایک احاطے میں ہیں جو بالکل ہمایوں کے مقبرے کی طرح ہے۔ ایک دن بابر بادشاہ کے مزار کی طرف سے بڑی کشش ہوئی۔ شہر سے دو میل پر ہے۔ ظاہر شاہ نے اسے سنگ سرخ سے بنوایا تھا۔ بابر کا انتقال آگرے میں ہوا تھا لیکن پھر انھیں کابل میں دفن کیا گیا۔ ان کے مزار پر بہت سکون حاصل ہوا۔ ایک اور بزرگ میر سبحان شاہ تھے جن کا مزار صحابیوں کے مزار کے راستے پر ہے۔ بہت خوبصورت بنا ہوا تھا۔

شہر میں ایک بازار کو شور بازار کہتے ہیں۔ حضرت نورالمشائخ پہلے وہیں رہتے تھے اس لیے انکو ملا شور بازار کہتے تھے۔ ان کے صاحبزادے ضیاء المشائخ مجددی نقشبندی مدظلہ اس وقت شہر کے قریب ۳ میل پر قلعہ جواد میں رہتے تھے۔ راستے میں جمال الدین افغانیؒ کا مزار ہے۔ ضیاء المشائخ صاحب کی مجلس میں بکثرت لوگ ہوتے تھے۔ کسی سے عربی میں، کسی سے فارسی میں، کسی سے پشتو میں اور کسی سے اردو میں بلا تکلف گفتگو فرماتے تھے اور مختلف زبانوں کے اشعار بھی پڑھتے جاتے تھے۔ انھوں نے ہم لوگوں کی پر تکلف دعوت کی۔ قندھار سے مولانا نصراللہ اور میرپور خاص سے مولانا محمد اسحاق جان صاحب بھی اس وقت مزار پر تشریف لے آئے تھے۔ ضیاء المشائخ صاحب کے کتب خانے میں قریب ایک سو آدمی دونوں وقت کھانا کھاتے تھے۔ وہیں ان کے

والد صاحب اور بعض عزیزوں کے مزارات ہیں۔

شہر سے قریب ۱۳۔۱۴ میل کے فاصلے پر پغمان ہے۔ اس کے راستے میں حضرت خواجہ محمد پارسا رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ محمد مسافر علیہ الرحمہ کا مزار ہے۔ پغمان بہت خوبصورت جگہ ہے۔ دو جھیلیں ہیں۔ سبزہ زار اور گلزار ہر طرف ہے۔ وہاں ایک بنگلے میں مولانا عبدالسلام مجددی صاحب قیام فرماتے تھے۔ انھوں نے بھی ہم لوگوں کی پرتکلف دعوت کی۔ پغمان کے قریب قرغہ بھی بہت خوبصورت جگہ ہے۔ وہاں عموماً نقشبندی سلسلے کے لوگ ہیں۔ قادری سلسلے کے کم ہیں۔ لیکن عام حضرات بھی بہت بااخلاق ہیں اور اکثر و بیشتر نمازی ہیں۔ وہاں کسی عالم سے ملنے جاتے تو سلام و دعا کے بعد وہ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے مکتوبات میں سے کچھ حصہ پڑھ کر سناتے، اس کی تشریح کرتے، دعا کرتے اور پھر خاطر مدارات کرتے تھے۔ روس سے قریب ہونے کی وجہ سے وہاں کے کچھ اثرات پائے جانے لگے تھے۔ لیکن عموماً دینی جذبہ پایا جاتا تھا۔ اور مسجدیں آباد تھیں۔ روس کے تعاون سے میڈیکل کالج، انجینئرنگ کالج وغیرہ بھی قائم تھے۔ ان میں باہر کے ملکوں کے طلبہ بھی داخل تھے۔ شہر میں روس کا قائم کردہ بہت بڑا روٹی پلانٹ بھی تھا۔ کپڑے کی ایک ہی مل تھی۔ زیادہ تر کپڑا پاکستان سے پہنچتا تھا۔ بازار میں سکھوں کی دکانیں بہت تھیں۔ لیکن وہ لوگ وہاں عموماً کمزور نظر آتے تھے۔ کتابوں کی دکانوں میں زیادہ تر نول کشور وغیرہ کی ہندوستانی مطبوعات تھیں۔ پاکستانی کتابیں بھی تھیں۔ کہیں کہیں قلمی کتابیں بھی تھیں جن کی قیمت ہمارے اندازے سے بہت زیادہ تھی۔ سیدھی سادی فارسی بولی جاتی تھی لیکن اس میں اخلاق کی شیرینی بہت تھی۔ کسی دکان پر ہم لوگ جاتے تو کثرت سے لوگ جمع ہو جاتے۔

راقم الحروف نے تاریخ بہرام شاہ غزنوی (انگریزی) ظاہر شاہ کے کتب خانے کے لیے پیش کی تو وہاں کے مہتمم نے میرا پاسپورٹ طلب کیا۔ اور اپنے دفتر میں اس کا

اندراج کیا۔ پھر میں پروفیسر حبیبی سے ملا۔ ان کو بھی اس تاریخ کا ایک نسخہ پیش کیا وہ اچھل پڑے اور کہنے لگے کہ آپ نے وہاں بیٹھ کر ایسی کتاب لکھی اور ہم لوگ غزنین سے قریب ہوکر بھی ابھی تک نہ لکھ سکے۔ حبیبی صاحب میرے دیرینہ کرم فرما تھے ایک مرتبہ لاہور سے وہ کراچی جارہے تھے میں حیدر آباد آرہا تھا۔ تو وہ میرے ڈبے میں آگئے۔ دیر تک کتابوں کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی صاحب کی لائبریری کے بعض قلمی نسخوں کا ذکر کیا تو انھیں حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔

مولانا ضیاء المشائخ (۱) ایک مرتبہ حیدر آباد بھی تشریف لائے تھے اور اس سے بہت پہلے حج کے ایک سفر میں ہوائی جہاز میں ان کی معیت کی سعادت بھی اس عاجز کو حاصل ہوئی تھی' بڑی شفقت فرماتے تھے۔ ان کے کتب خانے سے دو نادر کتابیں حاصل ہوئیں ایک تو حضرت مروج الشریعت محمد عبیداللہ رحمہ اللہ علیہ (م ۱۰۸۳ھ) ابن حضرت محمد معصوم سرہندی قدس سرہ (م ۱۰۷۹ھ) کے مکتوبات ہیں جو انھوں نے اورنگ زیب عالمگیر اور ان کے امراء و علماء وغیرہ کو لکھے تھے' اور دوسری کتاب ایک رسالہ "مشائخ طرق اربعہ" ہے جو حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کی ایک بیاض سے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی قدس سرہ نے نقل فرمایا تھا۔

حضرت مروج الشریعت محمد عبید اللہ رحمہ اللہ علیہ کے یہ مکتوبات ان کے صاجزادے تاج الدین ابوالحسن محمد ہادی علیہ الرحمہ نے جمع کیے تھے اور ان کا تاریخی نام "خزینۃ المعارف" (۱۰۹۴ھ) رکھا تھا۔ اس میں ۱۵۶ مکتوبات ہیں اور مکتوب الیھم یہ ہیں:۔

پدر بزرگوار۔ برادر خواجہ سیف الدین"۔ مولانا بدرالدین سلطان پوری۔ محمد حنیف کابلی۔ عبدالصمد کابلی۔ مولانا ابوالقاسم لاہوری۔ ملا حسن علی پشاوری۔ بادشاہ اورنگ زیب" مولانا فصیح الدین۔ شیخ محمد اسمٰعیل۔ مخدوم زادہ خواجہ محمد پارسا۔ شیخ عبدالکریم کابلی۔

خواجہ محمد غنی۔ خواجہ محمد بقا۔ حاجی حبیب اللہ بخاری۔ شیخ علیم جلال آبادی۔ مخدوم زادہ خواجہ محمد سالم۔ خواجہ عثمان کولابی۔ محمد سرور۔ خواجہ محمد افضل۔ جملۃ الملکی جعفر خاں۔ حاجی محمد معقول۔ شیخ بایزید سارن پوری۔ حافظ عبدالعزیز لاہوری۔ مخدوم زادہ خواجہ سعدالدین۔ خواجہ بدر۔ حافظ صبور۔ قناء خان۔ صوفی محمود کشمیری۔ میر محمد اسحاق۔ (مکرم خان) خواجہ عبدالآخر کابلی۔ جان محمد و شاہ محمد سلطان پوری۔ سید ابوالمعالی۔ میرزا محمد عادل بیگ و سلطان فتح اللہ۔ میر محمد یحییٰ کابلی۔ عبدالواحد قیام خانی۔ خواجہ احمد بخاری۔ شیخ فقیر اللہ بنگالی۔ میر محمد امین۔ خواجہ محمد یحییٰ۔ شیخ نور محمد۔ شیخ عبدالاحد۔ حافظ محمد صادق۔ مبارز خاں۔ محمد خان برکی بخاری۔ شیخ عبدالرحمٰن گجراتی۔ خواجہ ولی۔ محمد میرک بدخشی۔ شاہ زادہ (؟)۔ خواجہ محمد نقشبند ثانی۔ شیخ عبدالسلام۔ شیخ خلیل اللہ۔ ابوالمظفر برہان پوری۔ محمد ہادی (جامع مکتوبات) وغیرہ۔ شریعت اور معرفت کے مسائل کے علاوہ یہ مکتوبات تاریخ کے طالب علم کے لیے بھی بہت اہم ہیں۔ بادشاہ اورنگ زیبؒ کے نام نو مکتوبات ہیں جن میں سے دو (١١-٦٦) عربی میں ہیں بقیہ سات مکتوبات عربی اور فارسی دونوں (مخلوط) میں ہیں اور ان کی اسلامی حکومت کی تعریف ہے۔ طوالت کے خوف سے بعض مکتوبات کی نقل یہاں مناسب نہیں۔ لیکن اس رسالے کو من و عن پیش کیا جاتا ہے جس میں حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کے طرق کی تفصیل ہے:۔

رسالہ مشائخ طرق اربعہ جو حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ نے حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کی ایک بیاض سے نقل فرمایا تھا اور وہ کابل میں حضرت نورالمشائخ علیہ الرحمہ کے کتب خانے میں محفوظ تھا۔

انتساب ایں داعی کمینہ محمد الباقی بایں خانوادہ عالیہ چنان است کہ ایں کمینہ خرقہ پوشیدہ و مصافحہ کردہ و اجازہ تامہ عامہ و ارشاد یافتہ از حضرت مرشد علی الاطلاق و غوث

الآفاق فی المشارق و المغارب بالاستحقاق مخدومی و سیدی خواجه اسحٰق قدس سرهٗ وایشاں از دو جا اجازه و نسبت و ارشاد یافته اند۔ اولاً از والد خود حضرت قطب الاقطاب مولٰنا خواجگی کاسانی الدهبیدی قدس سرهٗ بعد ازاں از خلیفه الخلفائے ایشاں حضرت مولانا لطف الله قدس سرهٖ که هم پیره نیز بوده اند بحضرت مولاناخواجگی و حضرت مولانا لطف الله قدس سرهٗ از حضرت مولانا شاه حسین مرغینائی که از خلفاء حضرت خواجه احرارؒ اند۔ اولاً نسبت درست کرده مجاز شده بودند۔ بعد ازایشاں بحضرت مولانا محمد قاضی پیوسته ازایشاں نیز مجاز گشته اند۔ و بعد ازایشاں بحضرت مخدومی مولانا خواجگیؒ نیز بیعت کرده اند۔ وخدمات و ایثار هائے بے نهایت مالاً ونفساً به تقدیم رسانیده اند۔ پس ازاں جهت حضرت مولانا خواجگی قدس سرهٗ ایشان را صدیق خلفا و قائم مقام مطلق خود خوانده اند۔ پس معلوم شد که حضرت مولانا خواجگیؒ و حضرت مولانا لطف اللهؒ راانتساب واجازه از مولانا محمد قاضی است وایشاں راازخواجه احرارؒ است۔ اعنی حضرت ناصر الملة والدین خواجه عبید الله۔ ایشاں رااجازه وانتساب بحضرت مولانا یعقوب چرخیؒ است وایشاں را بخواجه بهاء الحق والدینؒ النقشبندیه است و ایشاں را بحضرت امیرکلالؒ ایشاں را بخواجه بابائے سماسیؒ وایشاں را بخواجه علی عزیزانؒ رامیتنی و ایشاں را بخواجه محمود انجیر فغنویؒ است و ایشاں را بخواجه عارف ریوگریؒ است و ایشاں را بحضرت قطب الاقطاب خواجه جهاں خواجه عبدالخالق غجدوانیؒ وایشاں را بخواجه یوسف همدانیؒ وایشاں را بخواجه ابوعلی فارمدی طوسیؒ و ایشاں را بخواجه ابولقاسم گرگانیؒ وایشاں را بشیخ ابوالحسن خرقانیؒ وایشاں را بشیخ بایزید بسطامیؒ وایشاں را به امام جعفر صادقؒ۔ و جعفر صادق رضی الله عنه را دو نسبت است۔ یکے به پدر بزرگوار خود امام محمد باقر رضی اللهٗ عنه و ایشاں را به امام زین العابدین رضی الله عنه وایشاں را به امام حسین رضی الله عنه و ایشاں را به پدر بزرگوار خود اسد الله الغالب علی ابن ابی طالب کرم الله وجهه و ایشاں نیز جامع دو نسبت اند۔ یکے از آنحضرت صلی الله علیه وسلم بے واسطه و دوم بواسطه خلفائے ثلاثه رضی اللهٗ عنهم۔ وایں نسبتے که امام جعفر

صادق را به آبای گرامی است رضی اللہ تعالیٰ عنہم سلسلۃ الذہب می نامند لشرافہ و نزاہہ و لطافہ و غیر ایں نسبت را سلسلہ الفضہ می گویند۔ و نسبت دیگر امام جعفر رضی اللہ عنہ بہ پدر مادر خود است قاسم بن محمد بن ابی بکرالصدیق رضی اللہ عنہم کہ از فقہائے سبعہ بودہ اند و ام کبائر ائمہ دین اند وایشاں را بحضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ است۔ وایشاں را نیز دو نسبت است، یکے از آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلا واسطہ۔ و نسبت دیگر بواسطہ خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم۔ لیکن از ہر یکے از خلفاء نسبتے خاص یافتہ و در طریق ذکر خفیہ قلبی و توجہ و مراقبہ باطن منسوب اند بحضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کہ طریق خاص ایشاں بودہ حضرات خواجگان قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم ورزش ایں نسبت نمودہ اند بدانچہ منسوب بحضرت صدیق اکبر اند رضی اللہ عنہ۔

مخفی نماند کہ خواجہ ابوالقاسم گرگانیؒ کہ پیر خواجہ ابوعلی فارمدیؒ است، ایشاں را نیز دو نسبت است، یکے بہ شیخ ابوالحسنؒ خرقانی کہ مذکور شد و نسبت دیگر ایشاں بہ شیخ ابوعلی کاتبؒ است وایشاں را بہ شیخ ابوعلی رودباریؒ وایشاں را شیخ ابوعثمان مغربیؒ وایشاں را بہ سیدالطائفہ شیخ جنیدؒ است قدس سرہٗ۔ و شیخ ابوالحسن خرقانیؒ بہ سہ جا منسوب اند، یکے بہ شیخ بایزید بسطامیؒ چناں کہ مذکور شد وایں بحسب روحانیت است و دیگر بہ شیخ ابوعلی رودباریؒ و شیخ ابوسعید ابوالخیر وایں دو ہم بحسب روحانیت است وہم بحسب معنی۔ و شیخ بایزید بسطامیؒ را نسبت و بیعت بحضرت امام بحق ناطق جعفر صادق رضی اللہ عنہ چنانکہ امام غزالیؒ در کتاب طیب القلوب خود آوردہ اند کہ شیخ بایزیدؒ بہ امام جعفر رضی اللہ عنہ بیعت فرمودہ و دوام ذکر اللہ اللہ و شکرے شکرے گفتے تا آں کہ از دنیا رحلت فرمودہ۔ انتہی کلامہ۔ و ہمچنیں است در کشف المحجوب شیخ علی عثمان جلابیؒ کہ معاصر شیخ ابوعلی فارمدی بودہ اند و در تذکرہ عطار قدس سرہما۔

پوشیدہ نماند کہ انتساب اجازت ایں کمینہ از طریقہ جہریہ و یسویہ اولاً باراز حضرت قطب الاقطاب غوث الخلائق و الطرائق حضرت قاسم شیخ ہمالمیانؒ عالم بالکبیر

بنکتی(؟)است بعده از شیخ المشائخ فی العالم الاعلم الافہم سید طبیب بلخی است، بعد ازایشاں از برادرایشاں اعنی السید السند العارف باللہ والغوث الاعظم الاعلم بلا اشتباہ سیدنا و مخدومنا و استاذنا سید عبداللہ البلخی مرہ بعداخریٰ و کرہ بعد اخریٰ اجازت نامہ عامہ ولباس خرقہ مشرف کردند و درہمیں طریقہ از مشائخ کبار بسیار بہ اجازت و ارشاد موفق و مبشر گردیدہ تحرزا" عن الاطناب مذکور نہ گردانید۔پس معلوم باشد کہ حضرت قاسم شیخ از طرق اربعہ مشہورہ مجاز بودند۔ لیکن روش طریقہ ایشاں جہر بودہ و دریں طریقہ منسوب و مجاز اند۔ اولا" از روے معنی از حضرت شیخ خداے دادؒ و از روے صورت از دو خلیفہ شیخ خداے دادؒ اول از خواجہ مولانا ثوریؒ کہ ہیچدہ سال در ملازمت ایشاں سلوک نمودہ مجاز شدہ اند بعدازاں از مشائخ طرق متعددہ بعد از سیاحت و ملازمت مشائخ بحضرت مولانا ولی کوہ دریؒ پیوستہ اندود ہیچدہ سال دیگر در خدمت ایشاں بودہ بعد از وفات ایشاں بہ مسند ارشاد نشستہ اندومی فرمودند' باآنکہ بہ کبر سن رسیدہ ام' اگر دانم کہ کسے باشد کہ ازو فائدہ می تواں گرفت' بقیہ عمر بخدمت آن عزیز بسری بردم و غاشیہ او بردوش کشیدہ درجلوےاو می روم و ایشاں یاد از کبراے محققین می دادند۔ ھنیا" لمن راہ و جالسہٗ و صاحبہٗ رضی اللہ عنہ۔ و حضرت شیخ خداے دادؒ را نسبت بہ شیخ جمال الدین شیخ جمال الدینؒ را نسبت بہ شیخ خادمؒ است۔ و حضرت مخدومی سید عبداللہؒ را مع برادر نسبت بزرگوار ایشاں است کہ اعلم علمائے زماں واکبر کبرائے وقت بودہ اند و مشہور اندر بقاضی صالح البلخی و حضرت مخدومی سیدعبداللہؒ را از مشائخ طرق متعددہ نسبتہا و اجازتہا بسیار است لم نذکرہ تحرزا" عن التطویل۔ و حضرت شیخ محمد صالحؒ المشہور بقاضی والسید شیخ علی شیخ است وایشاں را شیخ علیؒ است(؟) و ایشاں را بہ ایمن بابا است و بعضے بہ ایمن اتا گفتہ اند وایشاں را بہ صدر اتا۔ و بعضے ایمن اتا را نسبت بہ شیخ جمال شاشیؒ دادہ اند۔و صدر اتا را بہ زنگی اتا است و زنگی اتا را بہ حکیم اتا۔ و حکیم اتا را بہ حضرت برہان المحققین خواجہ احمد یسویؒ است وایشان را بہ شیخ ابویوسف ہمدانیؒ است و

نسبت شیخ ابویوسف ہمدانی تا آخر مذکور شد۔ و خواجہ احمد یسوی را دو نسبت دیگراست، یکے بہ شیخ شہاب الدین سہروری و دیگر بہ ارسلان بابا وایشاں را نسبت بہ حضرت سلمان فارسی رضی اللّٰہ عنہ نیز دادہ۔ چنانچہ خرقہ امانتی آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم را حضرت سلمان رضی اللّٰہ عنہ بہ ایشاں رسانیدہ اند و می تواند و بود کہ ایں نسبت ازراہ معنی باشد برتقدیر صحت۔ امّا نسبت این کمینہ در طریقہ علیہ کبرویہ ہمدانیہ فتحیہ از کبار مشائخ درآں طریق واقع شدہ خصوصاً از حضرت برہان المحققین و قطب العارفین و غوث السا لکین شیخ صدرالملۃ والدین البخاری القراکولی است کہ مدت دہ سال فی الخلوۃ والجلوۃ بالغدوّ والآصال والصحبۃ والسفر والحضر ملازم آستان عبودیت بودہ بنظرات خاصہ و لباس خرقہ از شیخ ترسوں المروی و شیخ نورالدین ابراہیم الحائی کہ ہم پیرہ ہائے مخدومی الاعظم شیخ صدرالدین بودند، میسرگردید۔ پس ایں ہر سہ عزیز را نسبت حضرت مخدومی قطب الاقطاب الشیخ الشہیرالسامی مولانا محمد الجامی است و ایشاں را نسبت بحضرت مخدومی الاعظم شیخ حاجی محمد الجبوشانی است وایشان را بحضرت شاہ البیدواری است وایشاں را انتساب بہ شیخ رشیدالبیدواری است و ایشاں را بہ امیرعبداللّٰہ البرزس آبادی است و ایشاں را بہ خواجہ اسحاق ختلانی و ایشاں را بہ امیرکبیر امیرسید علی الہمدانی است وایشان را بہ شیخ محمود مزداقانی وایشاں را بہ شیخ علاء الدولہ سمنانی وایشاں شیخ عبدالرحمان اسفرانی و ایشاں را بہ شیخ احمد الجرجانی وایشاں را بہ شیخ علی لالائی غزنوی و ایشاں رابہ شیخ مجدالدین بغدادی و ایشاں را بہ شیخ نجم الدین کبریٰ و ایشاں را بہ شیخ عمار یاسر وایشاں را بہ شیخ ابونجیب سہروردی وایشاں را بہ شیخ احمد غزالی و ایشاں را دو نسبت است، یکے بہ شیخ یوسف ہمدانی و دیگرے بہ شیخ ابوبکر نساج۔ و شیخ ابوبکرنساج را بہ شیخ ابوالقاسم گرگانی است وایشاں رانیز دو نسبت است چناں کہ ذکرشد، یکے بہ شیخ ابوالحسن خرقانی و دیگر بہ شیخ ابوعلی رودباری و ایشاں را شیخ ابوعثمان مغربی وایشاں را بہ شیخ جنید بغدادی وایشاں را بہ سری سقطی و ایشاں را بہ معروف کرخی۔ وایشاں را دو نسبت است، یکے بہ امام علی

موسیٰ رضاؒ الی آباء الکرامؒ۔ و دیگر به داؤد طائی و ایشاں را به حبیب عجمیؒ و ایشاں را به شیخ حسن بصریؒ و ایشاں را به حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔ وامام علی موسیٰ رضاؒ را انتساب به پدر خود است امام موسیٰ کاظمؒ و ایشاں را به پدر خود امام جعفر صادقؒ و ایشاں را دو نسبت است چناں که مذکور شد۔ واللہ اعلم۔

اما انتساب این کمینه در طریق عشقیه از دو جانب است، یکے از جانب مخدومی سید عبداللہ البلخیؒ و دیگرے از جناب شیخ محمد قلیؒ است و ایشاں را انتساب و به قہار شیخ و بابا شیخ است و ایشاں را به محمد صادق شیخ جو ایشاں را به ابوالحسن شیخ و ایشاں را به الیاس شیخ و ایشاں را به محمد قلی شیخ و ایشاں را به خدائے قلی شیخ و ایشاں را به میر غیاث الدین شیخ و ایشاں را به بایزید شیخ و ایشاں را به شیخ قوام الدین بسطامیؒ و شیخ بہاء الدین مغربیؒ و این دو عزیز منسوب اند به حضرت سلطان العارفین شیخ ابویزید بسطامیؒ و نسبت شیخ بایزید بسطامیؒ الی آخرہ مذکور شد۔

اما انتساب این فقیر و حقیر در طریقه قادریه و چشتیه به دو عزیز است۔ یکے به سید تاج الدین مکیؒ و دیگر به سید عبداللہ مکیؒ و این دو عزیز را انتساب به شیخ علی منعرؒ (منعبر؟) است و ایشاں را به شیخ محمد سجاویؒ و ایشان را به شیخ طاہر بن زیانؒ و ایشاں را به شیخ احمد بن موسیٰ بشیشی و ایشاں را به شیخ شہاب الدین زروقؒ و ایشاں را به شیخ ابوالحسن علی بشیشی به واسطه احمد بن موسیٰ مذکورہ شیخ ابوالحسن علیؒ را انتساب به والد خود است شیخ ابو حفص عمرانی علیؒ۔ و ایشاں را به سید مجد الدین ابو محمد صالح الزواریؒ است و ایشاں را به شیخ محمد مخلص طیسیؒ است و شیخ احمدؒ بن زندہ مرد(؟) و این دو را انتساب به شیخ شرف الدین ابن العادل است و ایشاں را به شیخ عبداللہؒ بن شجاع الدینؒ الفاروقی است و ایشاں را به شیخ جمال الدینؒ بن یوسف بن محمد بن نصیر معدی است و ایشاں را به شیخ عبداللہ محمد بن ابراہیم عبدالواحد بن سرور المقدسی است و ایشاں را به غوث الثقلین محی الدین عبدالقادر جیلانی قدس سرہ است و ایشان را به شیخ ابی سعید المبارکؒ بن علی

العزوی است و ایشاں را بہ شیخ ابی الحسن علیؒ بن محمد بن یوسف استرش الھکاری است و ایشاں را بہ شیخ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن عبداللہ الطرطوسی است و ایشاں را بہ شیخ عبدالواحدؒ بن عبدالعزیزؒ التمیمی است و ایشاں را بہ والد خود شیخ عبدالعزیزؒ است و ایشاں را بہ شیخ ابی بکرؒ محمد راتنشبلی است وایشان را بہ شیخ ابی القاسم الجنیدؒ البغدادی سید الطائفہ وایشاں را بہ سری سقطیؒ ایشاں را بہ شیخ معروف کرخیؒ بتفصیل الی آخر مذکور شد۔ (تا ایں جا سلسلہ ہای حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ بہ دستخط خاص ایشاں یعنی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ تفصیل وار گرفتہ شد)

(ا) حضرت ضیاء المشائخ کے بھائی، صدر المشائخ کے انتقال پر راقم الحروف نے پانچ اشعار کا ایک قطعہ تاریخ لکھا تھا جس کے ہر مصرع سے سنہ ۱۳۹۳ھ کے اعداد بنتے ہیں۔ کابل میں قلعہ جواد کے بزرگوں کی قبروں میں ان کی بھی قبر ہے اور لوح پر وہ اشعار ہیں۔

حضرت صدر المشائخ فضل عثمان علیہ الرحمہ (مجددی کابلی)

امن گاہ صدر المشائخ

۱۳۹۳ھ

شمس علماء امیر متقیان	رہبر دین، نصرت عقبیٰ
۱۳۹۳ھ	۱۳۹۳ھ
فضل عثمان قبلہ دارین	صدر و بدر مشائخ تقویٰ
۱۳۹۳ھ	۱۳۹۳ھ
حاج و حافظ، فقیہ نیک سگال	فاضل دودمان راہ صفا
۱۳۹۳ھ	۱۳۹۳ھ
گشت صبح بروج و قطب مدار	عارف زندہ دل ز فضل غرا
۱۳۹۳ھ	۱۳۹۳ھ
آہ از واسطہ حقیقت رفت	ہم طریقت شود ز قدر جدا
۱۳۹۳ھ	۱۳۹۳ھ

لمعات نشتر پر ایک نظر

(۱۹۷۲ء)

حضرت نشتر سندیلوی موجودہ دَور کے ایک باکمال اور پختہ کار شاعر ہیں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے استاد حضرت آرزو لکھنوی کے رنگ میں لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ یوں تو متاخرین شعرائے لکھنؤ کے یہاں عرصے سے خارجی اوصاف نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اور وہ بھی زیادہ تر غالب و مومن سے متاثر ہیں۔ لیکن آخری دَور میں تو اور بھی ان کی شاعری ہر بے اعتدالی سے پاک ہوچکی تھی۔ صفی، حسرت، عزیز اور آرزو وغیرہ کا کلام کس قدر بلند ہے! ان کے معاصرین اور تلامذہ بھی متانت اور سنجیدگی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ حضرت آرزو کی طرح نشتر بھی لکھنؤ کی شرافت اور وہاں کی تہذیب و ادبیت کے عَلَم بردار ہیں۔ ان کا قلم، ان کی وضع قطع اور ان کا رکھ رکھاؤ سب کا سب اسی مذاق کا آئینہ دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ادب جو عرفِ عام میں "برائے ادب" کہلایا جاتا ہے حضرت نشتر کے یہاں "سراپا ادب" ہے اور وہ ہر "غیرادبی" عنصر سے پاک ہے۔ سادگی زبان، تازگی بیان، معنی آفرینی، سوزوگداز اور رفعت مضامین وغیرہ ان کے کلام کی عام خوبیاں ہیں۔ دیکھیے، یہ اشعار ان خصوصیات کے حامل ہیں یا نہیں:۔

گلوں کا رنگ اڑا سرو و صنوبر پر گری بجلی — نقاب الٹی دم گلگشت یہ کس نے گلستاں میں

دل ان کے بس میں ہے ہم اختیار میں دل کے — بہت ہیں دور پہنچ کر قریب منزل کے

یہ اتفاق جو اک فرد کارواں تھا کبھی — یہ انقلاب اسے گرد کارواں دیکھا

نگاہوں پہ ڈالے ہیں کثرت کے پردے — چھپایا ہے یوں جلوہ عام اپنا

نگاہیں اٹھی ہیں ادھر ڈرتے ڈرتے — بہت بیقراری سے مجبور ہوکر

یوں محبت میں مہکتے ہیں مرے سینے کے داغ — جیسے پھولوں سے بھرا ہو کوئی دامان بہار

تم وعدہ کر رہے تھے دل تھا فریب خوردہ
ہنستی تھی بدگمانی کیا کیا مرے یقیں پر

چٹکی کلی کہ ٹوٹا اک آرزو بھرا دل
سنی ہوا کہ آئی آواز ہائے بلبل

کیا دیکھتا ہوں جاکے چمن میں ترے بغیر
جیسے کسی نے آگ لگادی بہار میں

مرا ذکر اور ان کے لب اللہ اللہ
یہ کس کی کہانی ہے کس کی زبانی

وہ شمع شمع نہیں جل کے جو پگھل نہ اٹھے
وہ قلب قلب نہیں ہے جو بے گداز رہے

دیے کیا کیا فریبِ جلوہ تو نے جلوہ گر ہوکر
کہیں احساسِ دل بن کر کہیں ذوق نظر ہوکر

مٹ کے بھی جاتی نہیں تاثیر سوزِ عشق کی
جب ہوا چلتی ہے لَو دیتی ہے پروانے کی خاک

ابھی ہوں غنچہ ابھی تبسم ابھی ہوں نغمہ ابھی ترنم
محبت بے پناہ بن کر تمام عالم پہ چھارہا ہوں

دکھا کے حسن کا جلوہ تو چھپ گیا کوئی
مگر گل و مہ و انجم میں ہے جھلک باقی

تصور میں تری تصویر آنکھوں میں ترا جلوہ
اسے میں کیا کروں دیدار سے سیری نہیں ہوتی

منزل عشق میں آتا ہے اک ایسا بھی مقام
اپنا ہونا بھی جہاں خود پہ گراں ہوتا ہے

نظر کہہ گئی داستان محبت
مگر چپ رہا بے زبان محبت

پڑنے لگی ہیں حسن کی نظریں
عشق بھی ظالم کتنا حسیں ہے

شمع بنا دل سوز سے جل کے
عشق آیا ہے نام بدل کے

یونہی اعتبار زمانہ نہیں ہے
لتے ہیں جیسے درختوں کے سایے

بعض چھوٹی بحریں بڑی دل کش ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

وہ نشیمن تھا میرا جان بہار
بجلیوں کو بھی جس پہ پیار آیا

حسن کو بے نقاب ہونا تھا
آپ اپنا جواب ہونا تھا

اپنا اپنا د ہے چمن میں
ہنستی ہیں کلیاں روتی ہے شبنم

اپنی مرضی پہ اور حسرت دید
جبر کے ساتھ اختیار کہاں؟

آجائے قرار عمر بھر کو
اتنا بھی نہ بے قرار کرنا

اشک ٹپک کر کچھ نہ رہے　　خاک میں موتی مل گئے سب
ایک حقیقت، ایک فسانہ　　موتی موتی، شبنم شبنم

ان چھوٹی بحروں کے برعکس ان کی طویل بحریں بھی بڑی پر کیف ہیں اور ان میں میر اور فانی کا رنگ جھلکتا ہے۔ صرف چند مطلعے ملاحظہ ہوں:۔

جب غم کی الجھن بڑھتی ہے یہ زیست بلا ہوجاتی ہے　　کہہ سکتے نہیں کیفیت دل کیا ہوتی ہے کیا ہوجاتی ہے

یوں عشق کی منزل سے گذرے ہر فرد بشر کا کام نہیں　　آنکھوں میں وہی ہے دل میں وہی پھر بھی تو زباں پر نام نہیں

نظر نظر گرم جستجو ہے کہیں بظاہر نشاں نہیں ہے　　ہیں جس سے معمور دونوں عالم وہ ایک جلوہ کہاں نہیں ہے

گزری ہوئی باتیں بھول بھی جا آشوب جدائی یاد نہ کر　　کیوں زخم جگر ہوجائیں ہرے اس دل کی خوشی برباد نہ کر

کلیوں نے چٹکنا چھوڑ دیا، پھولوں نے مہکنا چھوڑ دیا　　کچھ ایسی چمن کی ہوا بدلی، بلبل نے چہکنا چھوڑ دیا

حضرت نشتر کا یہ رنگ عام ہے اور ان کے ہر دور کا یہی انداز ہے۔ رباعیات، قطعات اور نظمیات میں بھی یہی رنگ ہے۔ خدا جانے انھوں نے ایسا کیوں کہا ہے کہ:۔

تہمت ہے شاعری کی ورنہ یہ ہے حقیقت　　نشتر یہ آپ بیتی اپنی سنا رہا ہے

تکملۂ مقالات الشعراء

(تحقیق۔ سندھ یونی ورسٹی حیدر آباد۔ ۱۹۹۴ء۔ ۱۹۹۵ء)

کراچی سے ۱۹۵۸ء میں تکملۂ مقالات الشعراء (مرتبہ فاضل گرامی پیر حسام الدین راشدی) شایع ہوا تھا۔ اسی زمانے میں راقم الحروف نے اس کا مطالعہ کر کے چند معروضات پیش کرنے چاہے تھے۔ لیکن وہ مختلف کاغذات میں شامل ہو کر نظر سے اوجھل ہوگئے تھے۔ اتفاق سے ان پر اب نظر پڑی اور وہ درج ذیل ہیں۔

تکملۂ مقالات الشعراء ۔

صفحہ ۳۱۔ سطر ۱۱۔ خواجہ محمد زمان (نقشبندی) یہ اضافہ بہتر ہوگا۔

صفحہ ۳۹۔ سطر ۵۔ بر چرخ کے بجائے از چرخ چاہیے۔

صفحہ ۴۰۔ سطر ۴۔ سود باشد کے بجائے سود آید چاہیے۔

صفحہ ۴۰۔ سطر ۷۔ حال تو کے بجائے احوال چاہیے۔

صفحہ ۴۰۔ سطر ۱۱۔ مصرع اس طرح ہوگا۔ زاں کام تلخ دارد شیرینی عبارت

صفحہ ۴۰۔ آخری مصرع۔ زاں رو کہ مرمراہست از لطف ایں مہارت

(صحت نامہ میں یہ تصحیح آگئی ہے)۔

صفحہ ۴۲۔ سطر ۱۲۔ "رفتہ زیبائی بزم شہروای"۔ اس کے اعداد ۱۲۸۶ھ بنتے ہیں' لیکن ۱۲۷۸ھ مطلوب ہیں۔ تخرجہ ضرور ہوگا۔

اسی صفحہ کے آخر میں ہے:۔ "بود غلام بنزد حسین" کے اعداد ۱۲۷۴ بنتے ہیں اور اس سے پہلے کے مصرع میں ایک عدد کا تخرجہ بھی کیا گیا ہے۔ یعنی ان دونوں تاریخوں کو اصل نسخے سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

صفحہ ۷۳۔ سطر ۱۸۔ نصیب اوالٰہی فضل قیوم الٰہی سے 'ایک عدد بڑھ جاتا ہے۔ الٰہی صحیح

ہوگا۔

صفحہ ۷۸۔ مصرع میں بکن ہوگا۔ یعنی:۔

ع۔ زفیض باتیے یارب بکن روشن دل مسکین

صفحہ ۱۳۲۔ سطر ۹۔ "اے حیف زہجر کشت مارا" کے اعداد ۱۲۸۶ ہوتے ہیں۔ ۱۳۰۶ھ نہیں بنتے۔ لیکن دوسرے شعر میں خوب تاریخ ہے:۔

اے جان پدر کجا برفتی کہ اشک آمدہ صبر بے جگر شد

یعنی مصرع اول کے اعداد (۹۸۷) میں اشک کے اعداد (۳۲۱) جمع کرنے اور صبر کے جگر یعنی ب کا عدد منہا کرنے سے مطلوبہ سنہ ۱۳۰۶ھ برآمد ہوتا ہے۔

صفحہ ۱۳۲۔ سطر ۱۸۔ بگوکہ "یمن محمد زمان بہشت شدہ" اس کے اعداد ۱۲۹۶ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مصرع اس طرح ہوگا۔ بگو "یمین محمد زماں بہشت شدہ" اب ۱۳۰۶ھ بن جائے گا۔

صفحہ ۱۳۴۔ آخری سطر۔ "بخلد پیش محمد زماں بہ زیب قبول" اس میں "بہ خلد"۔ چاہیے پھر ۱۳۰۷ عدد ہوجائیں گے اور ایک تخرجہ ہوگا تو مطلوبہ سنہ ۱۳۰۶ھ بن جائے گا۔

صفحہ ۱۵۶۔ سطر ۱۰۔ گفت ہاتف "شاعر نازک خیال" صحیح ہوگا۔ جس کے اعداد ۱۲۹۰ بنتے ہیں۔ "شاعرے" نہیں ہوگا۔ خلیل کے حاشیے میں بھی اسی طرح ہے۔

صفحہ ۱۶۰۔ سطر ۱۵۔ مصرع اس طرح ہوگا:۔ نام وتاریخش بود "نواب میر شہداد خان" اس کے اعداد ۱۲۷۴ ہوتے ہیں۔ حالانکہ وزن سے میر کا "ر" ساقط ہوتا ہے۔

صفحہ ۱۶۷۔ میں خلیل کا سال ولادت اس طرح درج ہے:۔

سال میلاد منیفش بسر الہام گفت دل

گوہر درج شرف علم لدن

اور یہی شعر صفحہ ۲۱۰ میں بھی اسی طرح ہے:۔

سال میلاد منیفش بسر الہام گفت دل   گوہر درج شرف علم لدن

دونوں صفحوں پر شعر کا پہلا مصرع، وزن سے ساقط ہے اور اس میں دوسرے مصرع سے ایک رکن زیادہ ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خلیل جیسے باکمال شاعر نے ایسا نہیں لکھا ہوگا۔ پہلا مصرع اس طرح ہو سکتا ہے:۔

سال میلاد منیفش گفت دل

لیکن "از سر الہام" سے ایک عدد کا تعمیہ بھی ہے اس لیے ایسا ایک شعر ضرور رہا ہوگا جس میں "از سر الہام" نے تعمیہ کا اشارہ کیا ہوگا اور ۱۲۴۳ کے اعداد پورے کیے گئے ہوں گے۔

صفحہ ۲۴۳۔ آخری سطر میں جو تاریخیں ہیں وہ اس طرح ہوں گی:۔

ملہم غیب و آیت اخلاص۔ لیکن "ملہم غیب" کے ساتھ "و" شامل ہوکر ۱۱۳۳ کے اعداد بنیں گے۔ البتہ "آیت اخلاص" کے اعداد ۱۱۳۳ بنتے ہیں۔

صفحہ ۳۳۰۔ سطر ۷۔ ع چہ احتیاج بجام مے و رحیق عابد

اس میں مے رحیق ہوگا۔ لیکن عابد کا ع ساقط الوزن ہے۔

صفحہ ۴۹۶۔ سطر ۱۵۔۱۶۔ میں اعداد و الفاظ اس طرح ہوں گے:۔

مرحبا= (۲۵۱) دل، حبذا(+۱۱۷) روحم، خرد فرمودزہ (+۱۲) جاں مبارک (+۵۴+۲۹۳) با تفّم گفتہ ھو(+۱۱) از بہر سال، حاصل جمع= (۱۲۰۳)، اس جگہ مطبوعہ نسخے میں "ہنسی" ہے جو غلط ہے۔

صفحہ ۵۴۸۔ سطر ۱۱۔ برخاستہ چاہیے برخواستہ صحیح نہیں۔

صفحہ ۸۲۳۔ سطر ۵۔ میں شعر کا آخری لفظ "بشکر چھپ گیا۔" بشعر چاہیے۔ شعر اس طرح ہوگا:۔

ستائش بگفت بے سر اہمال ہا تغم عبداللطیف از کرم حیدری بشعر

کتاب "صحیح اردو" میں اغلاط کی تصحیح

(جناب مجید احمد اثر زبیری لکھنوی کی کتاب "صحیح اردو" پر تنقیدی تبصرہ)

(تحقیق - سندھ یونی ورسٹی - حیدر آباد - ۱۹۸۹ء)

صفحہ ۵۔ الف۔ مناظَرہ و مباہَلہ۔ چوتھے حرف پر زَبر ہی صحیح ہے۔ زیر صحیح نہیں کیوں کہ یہ مُفاعَلت کے وزن پر ہے۔

صفحہ ۵۔ اُزْبَک ـــ اُزْبِک صحیح ہے۔ ب پر پیش غلط ہے۔

" - رَفو۔ را کے زبر کے ساتھ صحیح ہے۔ پیش کے ساتھ صحیح نہیں۔

صفحہ ۶۔ مناظرہ۔ مقابلہ۔ چوتھے حرف پر زَبر ہی صحیح ہے۔ (صفحہ ۵۔ الف میں بھی)

" - بھولا بھالا۔ بھولی بھالی۔ ہی صحیح ہے۔ آپ نے بھولا کے معنی سیدھا سادا لکھا ہے تو سادا صحیح نہیں۔ سادہ چاہیے۔

صفحہ ۶۔ الف۔ گھما گھمی ہی صحیح ہے۔

" - تک اور تلک پر پنڈت کیفی نے کیفیہ میں بحث کی ہے وہ ملاحظہ فرمائیں۔

صفحہ ۷۔ مملکت ـــ پہلے م پر زبر ہے اور لام پر (عربی میں) پیش، زبر اور زیر تینوں صحیح ہیں۔

" - ہرقل ـــ ہِرَقل ـــ ہِرَقْل دونوں صحیح ہیں۔

" - بَحرین ـــ صفحہ ۴ پر بھی آچکا ہے۔

صفحہ ۸۔ اسلحہ۔ سِلاح کی جمع ہے۔ سلح کی نہیں ـــ اسلحہ لام کے زیر کے ساتھ صحیح ہے لیکن یہ اقرباء، اولیاء کے وزن پر نہیں ہے۔ بلکہ اَفعِلَۃ کے وزن پر ہے۔

" - دیوار قہقہہ پر بحث کرنے کی یہاں کوئی ضرورت نہیں۔

" - "غلط العام" صحیح میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے۔ غلط العام (العوام) فصیح

نہیں سنا۔

صفحہ ۹۔ ہماشما۔ اس کا تجزیہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ "ہمہ شما" میں نے اپنے استادوں سے
کبھی نہیں سنا۔ لیکن ہمہ (سب) اور شما (آپ بھی) کہنے میں کوئی حرج معلوم
نہیں ہوتا۔

صفحہ ۱۱۔ نکتۂ خیال۔ آپ نے لکھا ہے لیکن میں نے آپ کا یہ لفظ کہیں دیکھا نہیں۔
نقطۂ نظر تو استعمال ہوتا۔

" ۔ فارغ خطی۔۔ الگ الگ لکھنا چاہیے۔ ملا کر لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

صفحہ ۱۲۔ متحدہ میں آپ نے حاء کو زیر کے ساتھ لکھا ہے لیکن جب متفقہ کے وزن
پر ہے تو متحدہ (حاء کے زبر کے ساتھ) چاہیے۔

" ۔ روح و رواں۔ اس کے متعلق استاذی مولانا احسن مارہروی مرحوم نے علی گڑھ
انٹرمیڈیٹ کالج میگزین (بابت اکتوبر ۱۹۳۰ء میں لکھا ہے:۔

"آج کل عمر رواں اور آب رواں کی طرح روح رواں کی ترکیب بھی بکثرت
تحریروں میں دیکھی جاتی ہے۔ میری تحقیق میں روح نہ عمر کی مترادف ہے، نہ
وہ ہر وقت پانی یا عمر کی طرح رواں رہتی ہے، بلکہ اس کی روانی کا اطلاق صرف
مرنے پر ہو سکتا ہے۔ چناں چہ۔۔ روح و رواں، عطف (و) تفسیری کے ساتھ لکھنا
چاہیے۔ جیسے رنج و غم، عیش و نشاط وغیرہ۔"

صفحہ ۱۳۔ دِرا۔۔ آپ نے زیر کے ساتھ لکھا ہے لیکن STEINGASS نے بھی زبر
کے ساتھ لکھا ہے۔

صفحہ ۱۴۔ وَرزِش۔۔ عربی میں نہیں ہے۔ لیکن بعض لغات میں ملتا ہے۔

صفحہ ۱۹۔ غیور۔۔ پیش کے ساتھ غلط ہے۔ غ پر زبر چاہیے۔ غفور کے وزن پر ہے۔

صفحہ ۲۰۔ گذشتہ۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم (دیباچۂ مکاتیب غالب عرشی ص ۲۲۳)

لکھتے ہیں کہ "گذشتن' گذاشتن' پذیرفتن۔ یہ سب ذ سے ہیں۔ البتہ گزاردن زے سے صحیح ہے۔ مرزا غالب نے پہلے نادانی سے' پھر سخن پروری اور سینہ زوری سے ذال کو فارسی سے خارج کرنے کی کوشش کی۔ اردو میں یہ لفظ زے سے لکھیے تو مضائقہ نہیں۔ مگر فارسی میں ذ لکھنا ضروری ہے۔"

صفحہ ۲۰۔ مَحاکات۔۔ آپ نے مَ پر زبر لکھنے پر زور دیا ہے جو غلط ہے۔ پیش ہی صحیح ہے۔ مراعات اور مساوات میں بھی مَ پر زبر چاہیے۔

صفحہ ۲۱۔ سہولت کے ضمن میں صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ سُ پر پیش صحیح ہے۔

صفحہ ۲۲۔ سنہرا موقعہ۔۔ موقع صحیح ہے۔ موقعہ صحیح نہیں۔

صفحہ ۲۳۔ مجریہ کے معنی جاری کردہ' اسم مفعول ہے' بروزنِ مرضیہ (اجراء کی مفعولی شکل نہیں ہے)

" ۔ غُلغلہ۔۔ آپ نے غ پر پیش فرمایا ہے اور زبر کو غلط فرمایا ہے۔ حالاں کہ عربی میں یہ زلزلہ کے وزن پر ہے۔ آپ نے بلاوجہ اس کا مخرج غُل فرمادیا ہے کوئی سند؟

" ۔ ترجَمہ۔۔ اس میں جیم پر زبر چاہیے اور زلزلہ کے وزن پر ہے۔ آپ نے جو تشریح فرمائی ہے وہ صحیح نہیں۔

صفحہ ۲۶۔ خواہ مخواہ۔۔ آپ نے خواہ مخواہ کو غلط کہا ہے۔ لیکن وہ فارسی میں آتا ہے۔ دیکھیں STEINGASS۔

" ۔ خودرَو۔۔ آپ نے را پر زبر کو صحیح فرمایا ہے لیکن زبر تو اسی وقت صحیح ہوگا جب کہ اُسے رفتن سے مشتق کہا جائے۔ لیکن اگر وہ روئیدن (اُگنا) سے مشتق ہے تو پھر راء پر پیش ہوگا اور پیش ہی صحیح ہے۔

صفحہ ۲۹۔ منشاء دلی۔۔ اس کو حذف کردیں۔ اس میں جو تشریح ہے وہ صحیح نہیں۔

صفحہ ۳۲۔ معرض ِوجود۔۔ آپ نے را پر زبر لکھا ہے جو غلط ہے۔ زیر لکھنا چاہیے کہ یہ باب ضرب یضرب سے ہے۔

صفحہ ۳۴۔ متنازعہ۔۔ آپ نے زؔ میں کسرہ دیا ہے۔۔ کیوں؟ (بہتر یہی ہے کہ اس پر بحث خارج کردیا جائے کہ غیر ضروری ہے۔)

صفحہ ۳۵۔ نورَیں' کہیں نہیں سنا۔ شاید آپ نے سنا ہو گا۔

" ۔ مخاصمت۔۔ آپ نے صؔ میں کسرہ لکھنا صحیح کہا ہے' حالانکہ فتحہ چاہیے۔ بر وزن مُفَاعَلَہ۔

" ۔ متزلزل۔۔ آپ نے دوسرے زا میں کسرہ لکھا ہے۔ وہ صحیح نہیں۔ فتحہ چاہیے۔

صفحہ ۳۶۔ مصاحبت۔۔ حضور والا۔ آپ نے مُفَاعَلَہ کی ہر جگہ مرمت کی ہے۔ یہاں حاء پر زبر صحیح ہے۔ زیر (کسرہ) غلط ہے۔

" ۔ مرنجان و مرنج۔۔ عطف نہ ہو تو کیا حرج ہے؟

صفحہ ۳۸۔ خاطر و مدارات۔۔ آپ نے عطف کو ضروری قرار دیا ہے۔ لیکن خاطر جب اردو معنی میں مستعمل ہے وہ پھر عطف کس طرح صحیح ہو گا؟

صفحہ ۳۹۔ زُمُرَّد۔۔ لیکن صحیح ہجّے اس طرح ہیں Zumurrud۔ اردو والوں پر زیادہ سختی نہ فرمایئے۔

صفحہ ۴۰۔ عروس۔۔ عؔ کے زبر کو آپ نے غلط کہا ہے حالانکہ زبر ہی صحیح ہے۔ بشارت میں بؔ میں فتحہ اور کسرہ دونوں ہیں۔

صفحہ ۴۳۔ مملکت۔۔ اس کی تشریح صفحہ ۷ پر آچکی ہے۔

" ۔ ماخذ۔۔ کی تشریح صحیح نہیں۔ ماخذ کے معنی اخذ کی جگہ۔

" ۔ مراسلت۔۔ کے سؔ میں کسرہ غلط ہے۔ فتحہ صحیح ہے۔

صفحہ ۴۶۔ مورَد۔۔ را پر فتحہ صحیح نہیں۔ کسرہ چاہیے۔ بروزن ِمسجد

" ۔ مراعات۔۔ مَ پر زبر صحیح نہیں۔ پیش چاہیے۔ آپ نے جو تشریح فرمائی ہے وہ صحیح نہیں۔

صفحہ ۴۸۔ اثبات۔۔ اس کی تشریح صفحہ ۲۵ میں آچکی ہے۔ آپ ہی نے فرمائی ہے۔

" ۔ مخادعین۔۔ اردو میں مستعمل نہیں۔ اس لیے حذف کردیں۔

صفحہ ۴۹۔ مُنزج۔۔ کمال کردیا آپ نے۔ حضور والا یہ لفظ مُنفَضِج ہے۔

" ۔ سیدھا سادا۔۔ اس کی تشریح میں آپ خود لکھ رہے ہیں کہ "سادہ جس میں بناوٹ نہ ہو۔" پھر سادا کیوں؟

صفحہ ۵۱۔ مَن گھڑت۔۔ مَن گڑھت۔۔ حضرت والا کی بحث صرف اس بات سے ختم ہوجاتی ہے کہ دہلی میں گھڑنا بولتے ہیں اور لکھنؤ میں گڑھنا۔ اب آپ جیسا فرمائیں۔

صفحہ ۵۲۔ افراتفری۔۔ یہ دراصل اِفراط و تفریط سے بنا ہے۔ اس لیے مزید بحث کی ضرورت نہیں۔

" ۔ مضافات۔۔ مُ پر پیش ہے۔ زبر نہ لکھیے۔

صفحہ ۵۳۔ یہاں بھی مطالبات میں لَ پر زبر لکھیے۔ تقاضا بھی لکھیے۔ تقاضہ نہ لکھیے۔

" ۔ چاق و چوبند۔۔ چاک و چوبند کوئی نہیں لکھتا۔ بعض لوگ بلکہ سندھ اور پنجاب کے لوگ قَ کو کَ ادا کرتے ہیں۔

" ۔ مذاکرات۔۔ کَ پر فتحہ لکھیے۔

صفحہ ۵۶۔ مواصلات۔۔ مُ پر پیش اور صَ پر زبر لکھیے۔

" ۔ حماقتیں۔۔ جہالتیں، کے متعلق ارشاد ہے کہ ان کے چوتھے حرف کو ساکن نہ پڑھیں بلکہ زبر لگائیں۔ بات تو صحیح ہے لیکن یہ گرفت صحیح نہیں ورنہ پھر قیمتی (مَ پر زبر)، ریشمی (شَ پر زبر) وغیرہ بولنا پڑے گا۔

" ۔ آپ نے لکھا ہے کہ تضیع اوقات لکھو، تضی اوقات نہ لکھو۔ اگر عوام نے
تضی کہہ دیا تو آپ نے اعتراض فرمادیا لیکن آپ نے جو تضیع لکھا ہے وہ
" ۔ بھی تو صحیح نہیں۔۔ تضییع (دو ی) چاہیے۔
" ۔ قلم پر بحث ہے کہ وہ "اپنی ذات میں واحد و یکتا ہے"۔ آپ کا ارشاد ہے
کہ وہ واحد مذکر ہے کہ شیراں، ہاتھیاں وغیرہ کی طرح اس کی جمع نہیں ہوتی
حقیقت کے پیش نظر دکنی اردو نہیں ہو ورنہ اس میں ایسی جمع بہت ہیں،
پھر دہلی اور لکھنؤ میں قلم کئی معنی میں مؤنث بھی ہے۔ صرف نوراللغات
ملاحظہ فرمالیں۔

صفحہ ۵۷۔ میں اسکول۔۔ اسٹول والی بحث کسی طرح بھی مفید نہیں۔ یہ مقامی لب ولہجہ
ہے اسے کوئی تبدیل نہیں کرسکتا۔

صفحہ ۵۹۔ میں آپ نے جم غفیر کو غلط کہا ہے۔ حالانکہ وہی صحیح ہے۔ کسی اچھی لغت
کو ملاحظہ فرمائیں۔

صفحہ ۵۹ میں سے رسل و رسائل حذف فرمادیں ۔ ضرورت نہیں۔

صفحہ ۶۵۔ مَلکہ۔۔ لیکن مَلَکہ (دسترس اور کمال کے معنی میں) کے مَ، لَ، کَ تینوں
ابتدائی حروف پر فتحہ ہے اور بادشاہ کی زوجہ کے معنی میں لام مکسور ہے۔

صفحہ ۶۶۔ مُوازَنہ۔۔ میں زاء مفتوح ہے۔ مکسور نہیں۔
" ۔ نَجات میں نون مفتوح ہے۔ مکسور نہیں۔
" ۔ چودھری اور چوہدری کے سلسلے میں "قیاس" صحیح نہیں ہے۔ یہ لفظ دونوں
طریقے پر صحیح ہے۔
" ۔ الف۔ تودے کی تشریح عجیب ہے۔ دہلی اور لکھنؤ میں تو سنا نہیں۔

صفحہ ۶۷۔ طُلَباء کو صحیح فرمایا ہے۔ دراصل طالب کی جمع طَلَبہ ہے۔ برصغیر میں
طُلَباء کہنے لگے ہیں۔

" - "پتہ نہیں" پر اعتراض صحیح ہے۔ لیکن آپ نے پتہ بھی لکھا ہے اور پتا بھی لکھا ہے۔ الف کے ساتھ چاہیے۔

صفحہ ۷۲۔ سطر ۲۔ "بے پرواہ" نہیں ـــ بے پروا لکھیں ـــ فتبارک اللہ احسن الخالقین (آیت) پر بھی نظر رکھیں۔

صفحہ ۷۳۔ سطر ۱ ـــ تماشہ نہیں، تماشا صحیح ہے۔

صفحہ ۷۴۔ تک۔ تلک کی بحث صفحہ ۶۔ الف میں آچکی ہے۔

صفحہ ۷۵۔ اگلا ـــ غالب نے صحیح کہا ہے کہ:

ع اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انھیں کچھ نہ کہو

صفحہ ۷۹۔ مت اور نہیں، پر بھی کیفیہ میں بحث ملتی ہے۔

صفحہ ۸۱۔ حماقتیں ـــ صفحہ ۵۶ پر بھی آچکی ہیں۔

صفحہ ۸۳۔ مرأت کا وزن آپ نے شرکت بتایا ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کا صحیح تلفظ مرآۃ ہے۔ اسی سے انگریزی میں Mirror بنا ہے۔

صفحہ ۸۵۔ مرادف اور مترادف پر بھی عمدہ بحث کیفیہ میں ہے۔

صفحہ ۸۶۔ جہاز ـــ جہیز۔ دراصل جہاز سے امالہ کر کے جہیز بنایا گیا۔ support۔

صفحہ ۸۹۔ غنا (بفتح غین) عربی میں مالداری کے معنی میں ہے اور غنا (بکسر غین) راگ گیت کے معنی میں ہے۔

صفحہ ۹۱۔ مہدی (بفتح میم)، اسم مفعول ہے۔ یعنی ہدایت یافتہ۔

صفحہ ۹۲۔ مکاتیب، مکتوب کی جمع ہے۔ اس کی تشریح صحیح نہیں فرمائی۔

صفحہ ۹۳۔ سطر ۵ ـــ اصلاحی آپ نے لکھا ہے کیا معنی؟

" - سطر ۱۱ ـــ "عدم واقعیت" مزاح میں نہیں، یعنی کیوں؟

صفحہ ۹۴۔ راطب نہیں، راتب صحیح ہے یعنی روز کی خوراک۔

صفحہ ۹۰۔ سطر ۱۹۔ شکر ہے یہاں آپ نے سلاح کی جمع اسلحہ لکھا ہے۔ صفحہ ۸ میں آپ نے سلح کی جمع اسلحہ لکھا تھا۔ لیکن پھر یہی عرض ہے سلاح کے س پر زبر نہیں بلکہ زیر ہے۔

صفحہ ۹۷۔ "تأمّل۔ تحمّل" حذف فرمادیں۔

صفحہ ۹۹۔ موجز کی تشریح غلط ہے۔ یہ ایجاز سے ہے (مختصر ہونے کے معنی میں)۔

" ۔ نزافت لفظ کوئی نہیں ہوتا۔ بلکہ نظافت لکھنا چاہیے۔

صفحہ ۱۰۱۔ انزلنا۔ نزلنا' اردو میں مستعمل نہیں۔

صفحہ ۱۰۴۔ عَرَق۔ عِرق' کی بحث حذف کردیں۔ بات لمبی ہوجائے گی۔

صفحہ ۱۰۶۔ مآثر' ماثور کی جمع نہیں بلکہ ماثرہ کی جمع ہے۔

صفحہ ۱۰۹۔ سطر ۱۹۔ بہ عینہٖ کوئی لفظ نہیں۔ بعینہٖ چاہیے۔

صفحہ ۱۱۲۔ آصف کے ص میں زیر نہیں' زبر ہے۔

" ۔ مَلَکہ کی بحث صفحہ ۶۵ میں آچکی ہے اور تصحیح بھی کردی گئی ہے۔

بقیہ صفحات میں بھی بہت غلطیاں ہیں۔

ادب منزل بمنزل ـــــ چند تنقیدیں

(العلم ـ کراچی ـ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۶ء)

یہ کتاب سترہ ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو محترمہ نے مختلف موضوعات پر لکھے ہیں بعض موضوعات یہ ہیں:۔

کشفی اور روحانی ادب' لافانی ادب' دلی میں اردو' لکھنؤ میں اردو' پنجاب میں اردو' ترقی پسند ادب۔ یہ عنوانات ایسے ہیں جن میں عمومی جائزے ہیں۔ لیکن خصوصی مطالعے کے بعد تیار کیے گئے ہیں۔جن میں شبلی' اکبر' مولانا محمد علی جوہر' مولانا ظفر علی خاں' علامہ اقبال وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام مضامین بظاہر مختصر' ہیں لیکن اپنے اندر جامعیت رکھتے ہیں۔ اور ان تمام متعلقات کو احاطہ کیے ہوئے ہیں جن کی ضرورت ہے "کشفی اور روحانی ادب" کے تحت انھوں نے الہامی یا قدیم آثار سے متعلق اقوال کا جائزہ لیا ہے۔ ایک جگہ لکھتی ہیں کہ:۔

"دنیا کے ماہرین علم الآثار نے تاریخ کے چھپے ہوئے پردوں سے ان کے علمی کارہائے نمایاں کو اجاگر کرکے تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسائل سے الجھے رہنا نوع انسانی کے مقدر میں لکھا تھا۔ تمدن اور تہذیبی دور کے شروع ہوتے ہی لا تعداد مشکلات سامنے آکھڑی ہوئیں۔"

محترمہ نے تمدنی ارتقاء کا یہاں کامیاب مطالعہ کیا ہے۔ اور وہ دنیا جو الجھنوں اور مشکلات ہی سے عبارت ہے ان کے زور قلم سے صحیح صورت میں جلوہ گر ہوجاتی ہے۔ ہماری معاشرتی زندگی یقیناً" معاشی زندگی سے مختلف اور بہائم کی زندگی سے بہت بلند ہے۔ لیکن اس دنیا میں رہ کر انسان کا واسطہ کس سے نہیں پڑتا؟ "گوشہ نشینی" اچھی ہو یا بری' اس کے لیے بھی معاشرتی زندگی کے سہارے کی ضرورت ہے۔ تو پھر ادب کیوں کر اس معاشرتی زندگی سے الگ رہ سکتا ہے؟ ادب کو بھی محض تفریح کا نہیں'

بلکہ انسانیت کی اصلاح کا ذریعہ بھی سمجھا جائے۔ اور اسی سے "خیر" کی توقع رکھی جائے۔ بڑی نیک فال ہے اور محترمہ نے "ترقی پسند ادب" کے باب میں اسی "خیر" پر زور دیا ہے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ "خیر" کسے کہا جائے؟ مادی نظریے والے جس چیز کو "خیر" سمجھتے ہیں، افسوس ہے کہ ہم لوگ اسے "خیر" نہیں کہہ سکتے۔ قومی اوراخلاقی قدریں ہر جگہ بدلی ہوئی ہیں۔ اسی لیے جو لوگ محض "مذہب" کو آلہ کار بنانا چاہتے ہیں وہ بھی دبی زبان یا ضمیر کی آواز سے مجبور ہوکر "مذہب" ہی کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ کفروالحاد کا ادب ہمارے معاشرے کا ترجمان نہیں کہلایا جاسکتا۔ محترمہ نے (کتاب) "اداس نسلوں" سے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"یہ لوگ بتاتے ہیں کہ لکھنے والے کے لیے کسی اہم داخلی یا خارجی سانحہ کا ہونا ضروری ہوتا ہے اور اگر بخت اوراتفاق سے سب خیریت رہے تو ان کی تخلیقی قوتیں جوں کی توں بیکار پڑی رہتی ہیں۔ انعام پانے والے مصنف صاحب ایک ماہ تک لاہور کے اسپتال میں نروس بریک ڈاؤن کے مرض میں مبتلا رہے۔ ان کا بیان ہے کہ صحت یاب ہوکر جب وہ وہاں سے نکلے تو انھوں نے دو تاریخی کارنامے انجام دیے۔ "یعنی اپنی کتاب کا پہلا باب لکھا اور دوسرے کسی سے محبت کی۔"

محترمہ نے خوب فرمایا ہے کہ:۔

"آگ لینے جانا اور پیغمبری مل جانا اسی کو کہتے ہیں"

جب "گوشت پوست" والی محبت ہی ہمارے مصنفین کا "ادب" ہو تو ظاہر ہے کہ جس "خیر" کی وہ تبلیغ کرتے ہیں اس میں "ادب" کے معنی بھی گھٹ کر "عفونت" کی حدود تک محدود رہیں گے۔ محترمہ نے طنزیہ انداز میں "غیر مقصدی" ادب کا جگہ جگہ تجزیہ کیا ہے۔ "لافانی ادب" کے ذیل میں وہ کہتی ہیں کہ:۔

"جب سے ادب کی داغ بیل پڑی اسی ایک کلیہ (مقصدی ادب) کی اساس پر

ساری ادبی کاوشیں کی گئیں ہیں لیکن جب ادیبوں اور ان کا تخلیق کردہ ادب اس ڈگر سے ہٹا تو اس نے اپنا بھرم کھودیا۔ غیر مقصدی ادب کی مثال ان حشرارت الارض کی سی ہے جو موسم برشگال میں از خود پیدا ہوتے ہیں۔ اور موسم کے گزرتے ہی اپنی موت آپ مرتے جاتے ہیں۔ ان کی غیر اہم ہستی کب عالم وجود میں آئی اور کب گرداب کی فنا کی نذر ہوگئی۔ اس پر ایک لمحہ بھی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک حیاتیاتی اجزاء کا تعلق ہے حشرات الارض اور انسانوں کے درمیان بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔ فنا کے عمل سے جب انسان دوچار ہوتا ہے تو فضاؤں پر رنجوری اور مجبوری طاری ہوجاتی ہے۔ نوحے اور مرثیے لکھے جاتے ہیں۔ لیکن حشرات الارض پر کوئی دو آنسو بہانے والا بھی نہیں ہوتا"

ایک محترمہ کے قلم سے "غیر مقصدی" ادب کا یہ تجزیہ ضرور قابل قدر ہے۔ اور ہمارے قومی مفاد اور ملکی اقدار کے تقاضوں کے مطابق ہے۔

ع اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

یہ مجموعہ جدید اردو ادب کے مطالعہ کے لیے بہت مفید ہے۔ اور "ترقی پسند" کے جامع و مانع تجزیے کے لیے از بس ضروری ہے۔ ہم تو بقول نظیری یہی کہیں گے کہ:۔

درس ادیب اگر بود زمزمہ محبتے!!
جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریزپاے را

دیباچہ "حیات فتح محمد"

(ایک محقق تین ادیب۔ مطبوعہ ۱۹۹۲ء مکتبہ ذوقی۔ حیدر آباد)

حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہمارے علماء اور صلحاء نے دین کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ انھوں نے دلوں پر بادشاہت کی ہے اور بڑے بڑے بادشاہ ان کے در کے فقیر بنے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شریعت سے شغف پیدا کرایا اور حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو دلوں میں جاگزیں کرادیا۔

حضرت فتح محمد علیہ الرحمہ کے حالات پڑھنے سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے دین و شریعت کی ترویج و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور بکثرت لوگوں کو اتباع شریعت کے لیے آمادہ اور دلدادہ بنایا ہے۔

حضرت علیہ الرحمہ کے معمولات، ارشادات، رشدوہدایات اور کشف و کرامات وغیرہ مختلف عنوانات کے ذیل میں بکثرت سبق آموز واقعات درج ہیں جو ہماری صلاح و فلاح کے لیے بہت مفید ہیں۔ ان کی کرامات یہ کیا کم ہیں کہ انھوں نے بے شمار لوگوں کی اصلاح فرمائی اور جادۂ شریعت پر گامزن کرادیا۔ لاکھوں رحمتیں نازل ہوں ان پر اور ان کے بزرگوں پر جنھوں نے سلسلہ عالیہ کے فیوض و برکات کو عام کیا اور دونوں جہانوں کی فلاح و خیر کا راستہ دکھلایا۔ ایسے تذکرے دین اور دین والوں کے لیے بہت ضروری ہیں اور ان کا مطالعہ گویا ان بزرگوں کی صحبت سے مستفید ہونے کے مترادف ہے۔

محترم حافظ احمد حسن دانش صاحب کا احسان ہے کہ انھوں نے ایک مفید علمی تحفے سے ہم کو نوازا۔ اللہ پاک ان کو جزائے خیر اور اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔

مولانا اعجاز الحق قدوسی (مرحوم)

(غیر مطبوعہ حاصل کردہ ڈاکٹر ارشاد الحق قدوسی۔ ۱۹۹۷ء)

مولانا اعجاز الحق قدوسی صاحب مرحوم میرے دیرینہ کرم فرما تھے۔ قریب پچاس سال پہلے جب میں کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی (برار) میں معلم تھا تو آپ کی ایک کتاب سیرت طیبہ حاصل کرنے کے لیے اپنی عقیدت کے جذبے سے متاثر ہو کر حیدر آباد دکن حاضر ہوا تھا کیوں کہ اس زمانے میں آپ وہیں پر قیام پذیر تھے۔ میری نوجوانی تھی اور آپ کی ادھیڑ عمر تھی' بڑی شفقت سے پیش آئے صرف اس خیال سے کہ میں نے ان کی دینی خدمات کی اس قدر قدر کی تھی۔ میں نے آپ سے وہیں کئی نسخے اپنے طلبہ کو انعام میں دینے کے لیے حاصل کیے پھر برابر میری عقیدت مندی قائم رہی۔ پاکستان بن گیا تو آپ کو ایک علمی ادارے میں کراچی میں دیکھا اور بے حد خوشی ہوئی کہ آپ برابر دینی کام میں مشغول تھے۔ کیوں کہ آپ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہ کی اولاد میں سے تھے اس لیے بزرگان دین سے بہت وابستگی تھی۔ اسی جذبے کے تحت آپ نے پاکستان کے مختلف علاقوں کے اولیاء کرام کے حالات سے متعلق کئی کتابیں لکھیں۔ انشاء اللہ یہی کتابیں ان کے درجات کی بلندی کے لیے گراں مایہ سرمایہ بنیں گی۔ دلی دعا ہے کہ اللہ پاک ان کے درجات عالیہ خوب خوب بلند فرمائے اور ان کی سخت کوشی اور اپنی محبت کی پیروی ہمارے نوجوانوں کو نصیب فرمائے۔ آمین

بجاہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

قاضی احمد میاں اختر مرحوم

(تحقیق۔ سندھ یونی ورسٹی ۹۵۔۱۹۹۴ء۔ حیدر آباد)

بہت لوگوں کی طرح راقم الحروف نے بھی بہت کچھ کھو کر پاکستان کا رخ کیا۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں کراچی کے محلے چاکی واڑہ میں ایک چھوٹے سے مکان میں قیام کیا۔ چند ماہ بعد اسلامیہ کالج قائم ہوا تو مجھے وہاں لے لیا گیا۔ قاضی احمد میاں اختر مرحوم ۱۹۴۹ء میں کراچی تشریف لائے اور وہاں کھارادر کے ایک اچھے مکان میں قیام پذیر ہوئے۔ مشہور مزاحیہ شاعر مجید لاہوری بھی وہیں تھوڑے فاصلے پر رہتے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ ان دونوں حضرات سے میری ملاقات کب اور کس طرح ہوئی لیکن میں اکثر قاضی صاحب ملاقات کے لیے جانے لگا۔ اس وقت بھی ان کے پاس مختلف علوم و فنون سے متعلق سیکڑوں کتابیں تھیں۔ حتیٰ کہ مغربی موسیقی پر بھی کتابیں تھیں۔ قاضی صاحب سے کبھی کبھی علمی مشورے بھی لیتے رہتے اور ان کی بعض کتابوں سے بھی مستفیض ہوتا۔ میں پھر پیر الٰہی بخش کالونی کے ایک کوارٹر میں منتقل ہو گیا اور قاضی صاحب انجمن ترقی اردو کے دفتر میں آگئے۔ اس وقت ان کو صرف پانچ سو روپے ملتے تھے مجھ سے فرماتے تھے کہ "گھر میں پانچ افراد ہیں۔ ہر فرد کا ایک ایک سو حصہ بن جاتا ہے۔" ۱۹۵۰ء میں بابائے اردو نے اردو کالج قائم کیا تو راقم الحروف کو وہاں بلوالیا۔ قاضی صاحب پھر بندر روڈ پر ڈاؤ میڈیکل کالج کے قریب ایک فلیٹ میں منتقل ہو گئے۔ میں وہاں بھی حاضر ہوتا تھا۔ معلوم نہیں، قاضی صاحب کو مجھ حقیر کے متعلق کیا مغالطہ تھا کہ بعض علمی باتوں میں مجھ سے مشورہ لیتے تھے۔ کبھی کبھی رباعی کے اوزان پر بھی گفتگو کرتے تھے۔

قاضی صاحب سے مجھے غائبانہ تعارف اس وقت حاصل ہوا تھا جب کہ رسالہ مصنف (علی گڑھ) میں ان کا عالمانہ مضمون ولی سے متعلق شائع ہوا تھا۔

۱۹۵۳ء میں غالباً" محترم ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب کی کوشش سے سندھ یونی ورسٹی کے دین دار اور علم دوست وائس چانسلر علامہ آئی آئی قاضی مرحوم نے قاضی صاحب کو اپنی یونی ورسٹی میں لے لیا اور مکان نمبر۹ ان کو الاٹ کردیا۔ پاکستان میں غالباً" حافظ محمود شیرانی مرحوم کے بعد یہ دوسری مثال ہے کہ ظاہری ڈگریوں کے بغیر، محض علم و فضل کی بنا پر کسی کو یونی ورسٹی میں استاد مقرر کیا ہو۔ قاضی صاحب یونی ورسٹی میں آئے تو ان کی قابلیت کی دھوم مچ گئی۔ بعض اساتذہ مستقل طور پر ان سے فیض یاب ہونے لگے اور وہ خود رات کو بڑی دیر تک مصروف مطالعہ رہتے تھے اور سخت محنت کے ساتھ اپنا لیکچر تیار کرتے تھے۔ افسوس کہ وہ زیادہ عرصے تک کام نہ کرسکے اور ۱۹۵۵ء میں اللہ کو پیارے ہوئے۔

میں نے ایک صاحب کے پاس مرحوم کی ایک بیاض دیکھی ہے جس میں بکثرت موضوعات اور ان کے منابع درج تھے۔ خدا جانے وہ بیاض کیا ہوئی اور کہاں گئی۔

قاضی صاحب کے عالمانہ مضامین انجمن ترقی اردو نے شایع کردیے ہیں۔ راقم الحروف نے فی الحال ولّی سے متعلق ان کے مضامین دیکھے ہیں۔ بہت تلاش اور کاوش سے لکھے گئے ہیں۔ بعض صفحات میری دل چسپی کے ہیں۔ مثلاً":-

ولّی پر قاضی صاحب کے کئی مضامین ہیں۔ انھیں گجراتی کہیے یا دکنی کہیے، ایک ہی بات ہے کیوں کہ دکن کا اطلاق جنوبی ہند کے علاقے پر ہوتا تھا جو دریاے نربدا سے لے کر گجرات تک اور جنوب میں مدراس اور راس کماری تک تھا۔

صفحہ ۷۴۔ علی رضا، ولّی کے پیر تھے اور وہ علامہ فرخ شاہ (ابن حضرت خواجہ محمد سعید رحمہ اللہ علیہ ابن حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ) کے صاحب زادے تھے۔ لیکن علوم سیمیا، کیمیا، ریمیا اور نغمہ و سماع سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ پھر توبہ کرکے اپنے والد صاحب سے رجوع ہوگئے تھے۔ گجرات چلے گئے تھے۔ وہیں ان کے پانچ

صاحب زادے تھے۔(دیکھیں گلشن وحدت' کراچی ۱۹۶۶ء۔ صفحہ ۱۷۴-۱۷۶)

قاضی صاحب نے ولی پر بہت عمدہ تحقیق کی ہے' لیکن اس زمانے میں کئی ولی تھے۔ ایک ولی ویلوری تھے جنھوں نے روضۃ الشہداء' روضۃ العقبیٰ' روضۃ الانوار لکھی تھیں(دیکھیں معارف' جنوری ۱۹۴۰ء)۔ ایک اور ولی اسی عصر کے تھے اور انھوں نے بھی روضۃ الشہداء لکھی تھی۔ اس کا ایک نسخہ میرے ایک کرم فرما لطیف الرحمٰن صاحب نے مجھے عنایت کیا تھا اور وہ قاضی صاحب کے یہاں ان کی وفات کی وجہ سے رہ گیا۔

صفحہ ۷۸۔ جھرنا(رسنا) کو گجراتی میں کہا ہے۔ لیکن وہ اور بعض دوسرے الفاظ جو گجرات سے مخصوص کیے گئے ہیں وہ جبل پور(سی-پی) تک میں بولے جاتے ہیں۔

صفحہ ۷۸۔ گجرات میں بنیوں کو بقال کہتے ہیں' لیکن یہ گجرات تک مخصوص نہیں۔

صفحہ ۷۹ مناہی ممانعت کے معنی میں گجرات میں بولا جاتا ہے۔ بے شک' لیکن وہیں کے لیے نہیں ہے۔ انیس کا مصرع ہے

؎ گھر میں سادات کے' پانی کی مناہی ہے آج۔

صفحہ ۹۵--۹۷ میں دکنی کی بات ہے۔ ولی ویلوری کے سلسلے میں عرض کیا گیا تھا کہ اشتیاقی نے ۱۰۰۴ھ میں مثنوی اساس المصلیٰ کو دکنی کہا ہے۔(معارف جنوری ۱۹۴۰)۔

صفحہ ۱۵۱۔ پور' سیلاب کے معنی میں جبل پور میں بھی بولا جاتا ہے۔ جھانجھ پھٹکار بھی وہاں بولا جاتا ہے۔

صفحہ ۱۵۲۔ سال دینا بھی وہاں بولتے ہیں۔

صفحہ ۱۵۵۔ ادھر(معلق)' اڑ(ضد) بھی وہاں مستعمل ہیں۔ حال سے بے حال ہونا بھی وہاں بولتے ہیں۔

صفحہ ۱۵۶۔ پٹکا۔ تان لینا(تاننا۔کھینچنا)' چونا(ٹپکنا)' دھاوا(حملہ)' گھانا۔گھانی۔

لٹ (بالوں کی) بھی بولتے ہیں۔ اور دوسرے مقامات میں بھی ان کا استعمال سنا ہے۔

صفحہ ۱۵۷۔ ہنسلی بھی وہاں بولتے ہیں۔ لڑکوں اور عورتوں میں اس کا بہت رواج ہے۔

صفحہ ۱۵۸۔ زرد رو گجرات ہی میں نہیں، وہ تو فارسی میں بھی ہے۔ راقم الحروف نے قاضی صاحب کے ولیؔ سے متعلق مضامین دیکھے۔ مجموعے میں چند مضامین اور ہیں لیکن افسوس کہ کمزوری کی وجہ سے فی الحال ان کو دیکھنے کی طاقت نہیں۔

وما توفیقی الّا باللہ۔

حضرت ذوقی صاحب الہ آبادی

(ایک محقق تین ادیب ۔ مطبوعہ حیدر آباد ۱۹۹۲ء)

حضرت حکیم ذوقی صاحب مرحوم سے میرے تعلقات ۱۹۵۶ء سے شروع ہوئے جب کہ سندھ یونی ورسٹی میں میرا تقرر ہوا تھا۔ تعارف تو صرف اس وجہ سے ہوا تھا کہ وہ اچھے کاتب تھے۔ لیکن ملاقات کے بعد ان سے دو رشتے نکل آئے۔ ایک تو یہ کہ وہ نقشبندی سلسلے میں منسلک تھے جس سے میرا تعلق ایسا ہے گویا:۔

بدنام کنندہ نکو نامے چند

دوسرا رشتہ یہ تھا کہ وہ الہ آباد میں میرے بزرگ استاد قاری ضیاء الدین احمد صاحبؒ کے چھوٹے صاحب زادے قاری محب الدین صاحب مدظلہ کے شاگرد رہ چکے تھے۔ میرے لیے یہ دو رشتے بہت اہم تھے اور انھی کی وجہ سے میں ان سے قریب سے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ(۱)عالم ہیں اور عربی درسیات میں بہت کچھ بہرہ مند ہیں۔(۲)فارسی میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔(۳)حافظ ہیں۔(۴)قاری ہیں۔(۵)شاعر ہیں۔(۶)ادیب ہیں۔(۷) حکیم ہیں۔(۸)ہومیوپیتھ ہیں۔(۹)ہائڈروپیتھ ہیں۔

یعنی کاتب ہونے کے علاوہ یہ تمام اوصاف بھی ہیں ۔ لیکن ان تمام اوصاف حمیدہ پر ان کے اخلاق کریمانہ غالب تھے اور تواضع و انکسار ان کی طبیعت کا خاص رنگ تھا۔ ان تمام اوصاف اور کمالات کی وجہ سے ان کا گھریلو ماحول خاصا دینی تھا اور اسی وجہ سے ماشاء اللہ ان کی تمام اولاد نیک اور صالح رہی ہے۔ اور اعزا بھی اس ماحول سے بڑی حد تک مستفید ہوتے رہے ہیں۔ان سے کبھی نیاز حاصل ہوتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ گویا اپنا کوئی خاص الخاص عزیز مل گیا اور جب ان سے رخصت ہونا پڑتا تھا تو دیر

(۱)۔ان ہی موصوف کے متعلق ایک اور مضمون کتاب "انعمت علیہم" میں آچکا ہے۔ لیکن اس مضمون سے یکسر مختلف ہے۔

سے یکسر مختلف ہے۔

تک ان کی محبت دل میں چٹکیاں لیتی رہتی تھی۔ پھر ان کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے ایک قریبی عزیز سے جو ڈپٹی کمشنر تھے بعد میں کمشنر بھی ہو گئے تھے صرف اس لیے نہیں ملتے تھے کہ کہیں دنیا درمیان میں نہ آجائے۔

چوں کہ وہ حافظ تھے اس لیے انھیں ہر روز ایک منزل پڑھنے کی سعادت بھی حاصل ہوجاتی تھی اور قاری ہونے کی وجہ سے وہ باقاعدہ تجوید کے ساتھ حدر میں بھی قرآن پاک پڑھا کرتے تھے۔ یہ سعادت بھی بہت بڑی تھی جو ہر حافظ کو حاصل نہیں۔ راقم الحروف نے کبھی کبھی غریب خانے پر محراب سنانے کے لیے انھیں زحمت دی ہے۔ اور جب وہ تراویح پڑھاتے تھے تو ایک احتیاج یہ ملحوظ رکھتے تھے کہ آیات سجدہ کو پست آواز سے پڑھتے تھے تاکہ غیر نمازیوں پر سجدہ واجب نہ ہوجائے۔

اسی احتیاج کی وجہ سے وہ لاؤڈاسپیکر کے استعمال کو پسند نہیں فرماتے تھے کیوں کہ اس طرح اذان اور قرآن کا احترام نہیں رہتا۔ یعنی حکم تو یہ ہے کہ "جب قرآن پڑھا جائے تو سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحمتیں نازل ہوں۔"

چناں چہ لاؤڈاسپیکر کی وجہ سے جب آواز پھیلے گی اور مختلف مسجدوں سے مختلف اوقات میں آواز آئے گی تو سننے والا کس کس آواز کو سنے گا اور خاموش رہے گا! اس سلسلے میں انہوں نے ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔

ماشاء اللہ مرحوم نے کئی بچوں کو حافظ بنایا اور سبھی بچوں اور بچیوں کو کتابت سکھائی۔ ان کو اپنی ایک بچی آمنہ جمال سے بڑی محبت تھی۔ وہ بہت اچھی کتابت کرتی تھی۔ راقم الحروف نے اس کی شادی کے موقع پر یہ قطعہ تاریخ لکھا تھا:

بچی عزیزہ، حضرت ذوقی کی نورِ چشم — خوش بخت، خوش مزاج و خوش اخلاق و خوش مقال
ماں باپ سے وہ ہوتی ہیں رخصت بحکمِ شرع — سب کی دعا ہے وہ رہیں خوش حال و خوش مآل
"بہجت نصیب و عصمت و عفت کی آبرو" — "ہیں آمنہ جمال عروس ملک خصال"

۲ ذی قعدہ (۱۳۸۳ھ) — ۱۹۶۳ء

افسوس کہ پھر اس بچی کے انتقال پر بھی مجھے یہ قطعہ تاریخ لکھنا پڑا

آہ! آں بنت حضرت ذوقی ذی جاہ — رفت چوں دخترش ولادت یافت

خوش رقم، خوش بیان و خوش دل بود — صبر و شکر و رضا بہ عادت یافت

"در بہشت آمنہ جمال شد" — "ایں ہمہ رحمت از شہادت یافت"

۱ ۳ ۸ ۸ ھ (پنج شنبہ ۷ رمضان المبارک) — ۱ ۹ ۶ ۸ ء ۲۸ نومبر ۱۹۶۸ء

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ حضرت ذوقی مرحوم تصوف میں سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں منسلک تھے اور حیدر آباد کے مشہور بزرگ حضرت پیر ایرانی صاحب مدظلہ کے دامن تربیت سے وابستہ تھے۔ حضرت صاحب ہمیشہ ذوقی صاحب پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور مختلف طریقوں سے نوازتے رہتے تھے۔ ایک عرصہ تک آپ نے ایک رسالہ بھی ان کو تفویض فرمادیا تھا اور اپنی کتابوں کی کتابت اور طباعت بھی انھی کے ذمہ کردی تھی۔

مرحوم سے راقم الحروف نے کئی نادر کتابیں بھی کتابت کرائی تھیں جن کی وجہ سے ان کی روحانی کیفیات میں غیر معمولی اضافہ ہوا تھا اور جیسا کہ مرحوم نے مجھے بتایا تھا، انھی کیفیات کی وجہ سے ان کے پیر صاحب نے انھیں خلافت عالیہ سے بھی سرفراز فرمادیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اس منصب کے اہل بھی تھے۔ یہاں بے محل نہ ہوگا اگر ان کتابوں کا ذکر بھی کردیا جائے جن کی کتابت کے لیے مرحوم کو زحمت دی گئی تھی:-

(۱) ہدایت الطالبین۔ ۱۹۵۶ء (۲) علمی نقوش۔ ۱۹۵۶ء لیکن دوسرے سال شائع ہوئی۔ (۳) رسائل مشاہیر نقشبندیہ۔ ۱۹۵۸ء (۴) ملفوظات۔ ۱۹۵۹ء (۵) ارشاد رحیمیہ۔ ۱۹۵۹ء (۶) انتخاب مکتوبات امام ربانیؒ۔ ۱۹۶۱ء دوبارہ ۱۹۶۳ء (۷) آگاہی امیر کلالؒ۔ ۱۹۶۱ء (۸) دیوان روشن۔ ۱۹۶۱ء (۹) ترجمہ مخدوم نوحؒ (پہلا پارہ) ۱۹۶۲ء (۱۰) تحریر و تقریر۔ ۱۹۶۲ء (۱۱) اثبات

النبوۃ(اردو ترجمہ)۔ ۱۹۶۳ء(۱۲)وسیلۃ القبول(حصہ اول)۔ ۱۹۶۳ء(۱۳)وسیلۃ القبول(حصہ دوم)۔ ۱۹۶۳ء(۱۴)مکاشفات عینیہ(متن مع ترجمہ)۔ ۱۹۶۴ء(۱۵)حضرت مجدد الف ثانیؒ (ایک تحقیقی جائزہ)۔ ۱۹۶۵ء(۱۶) تاریخ اسلاف۔ ۱۹۶۵ء(۱۷)سعید البیان۔ ۱۹۶۵ء(۱۸)مجمع البحرین۔ ۱۹۶۵ء(۱۹)گلشن وحدت۔ ۱۹۶۶ء(۲۰) تحقیق الحق المبین۔ ۱۹۶۶ء(۲۱)قرآنی عربی۔ ۱۹۶۶ء(۲۲)وصال احمدی۔ ۱۹۶۸ء(۲۳)مکتوبات سیفیہ۔ ۱۹۶۸ء(۲۴)رسالہ سلوک مع سلاسل خواجہ باقی باللہؒ۔ ۱۹۶۹ء(۲۵)خزینہ المعارف۔ ۱۹۷۳ء۔ ان کے علاوہ مکتوبات امام ربانیؒ(فارسی) کے بعض مقامات کی تصحیح و ترقیم بھی مرحوم کے قلم سے ۱۹۷۲ء میں ہوئی تھی۔

راقم الحروف کے بیٹے کے مکان پر ۱۱۔۱۲ فٹ کا طویل ترقیمہ بھی آپ کے قلم سے ہے۔ وائس چانسلر علامہ قاضی اور ان کی بیگم کے مزارات کے کتبے بھی آپ ہی نے لکھے تھے۔

مرحوم نے ۱۹۷۳ء میں خزینہ المعارف کی کتابت کی تھی۔ یہ آخری کتاب تھی اس کے بعد وہ اللہ کو پیارے ہوئے۔ راقم الحروف نے ان کی وفات پر (لوح مزار کے لیے) یہ قطعہ تاریخ لکھا تھا:

"حکیم سامی عبدالغفار صاحب مصطفائی الہ آبادی" (۱۹۷۳ء)

"مکرم زمان حکیم ذوقی صاحب" (۱۳۹۳ھ)

عالم و عارف شیخ طریقت — حافظ و قاری ذوقی صاحب

تھے وہ حکیم حاذق و کامل — سب کی خیر کے ہر دم طالب

ثلث رقاع کے ماہر تھے وہ — خطاطی میں سب پر غالب

خلق عظیم و قول احسن — تھے وہ اسی دولت کے جالب

بے شک تھے اللہ کے پیارے — ہر دم تھے اللہ سے تائب

ان سے خطاب ہوا، ہوگا یوں — سن لیں سب احباب و اقارب

"پائی عظمت اپنی عزت — پائی جنت ذوقی صاحب"

۱۹۷۴ء دو شنبہ ۳ جولائی — ۱۳۹۴ھ یکم جمادی الاخریٰ

ان کے جانے سے ان پر ضرور اللہ کی رحمتیں نازل ہوئی ہوں گی اور بفضلہ تعالیٰ وہ اعلیٰ علیین میں ہوں گے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان جیسا کاتب اب یہاں کوئی بھی نظر نہیں آتا اور یہ اہل قلم حضرات کے لیے بڑی محرومی ہے۔

اللہ پاک ان کے درجات عالیہ کو اور بھی بلند فرمائے اور پس ماندگان کو ان کے نیک نقش قدم پر دائم و قائم رکھے۔

حافظ صابر

(ایک محقق تین ادیب ۱۹۹۲ء حیدر آباد)

عزیز گرامی حافظ صابر بن ذوقی جس گھر کے چشم و چراغ ہیں وہاں شرع و دین، علم و فضل، زہد و تقویٰ ہی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ ان کے والد حضرت ذوقی مرحوم حافظ بھی تھے، قاری بھی تھے، عالم بھی تھے، شاعر، حکیم اور مشہور خطاط و خوشنویس تھے اور اس قدر فنون میں مہارت رکھتے تھے کہ بہت کم لوگ ان جیسے نظر آتے ہیں۔ حافظ صابر نے اپنے والد مرحوم کے بہت سے فضائل ورثے میں پائے ہیں جن کا پرتو ان کی شاعری میں جگہ جگہ موجود ہے۔

ایک اچھا شاعر اپنی اور پرائے کی زندگی کا شعور رکھتا ہے، اسی لیے صابر خود اپنی زندگی ہی کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں کہ:۔

محروم روزگار ہوں صابر تو کیا ہوا　　زندہ بہت سے لوگ ہیں محرومیوں کے ساتھ
جو رنج و غم عطا ہوں دوستوں سے　　اگر صابر ہو تم دل سے چھپالو

تواضع و انکساری بھی صابر کو ورثے میں ملا ہے۔ اسی لیے ایک غزل میں ان کے ایسے تمام شریفانہ خصائل کا ذکر ہے:۔

تجھ سے بڑے اور بہتر صابر　　دوست ہیں تیرے اکثر صابر
جاہل، عاصی، کمتر صابر　　کون ہے تیرا ہمسر صابر
جب سچ کی میزان میں تولا　　جھوٹا نکلا یکسر صابر
قریہ قریہ میں نے چھانا　　کوئی نہ دیکھا کمتر صابر
دنیا میں ارباب وفا کی　　روتے گزری اکثر صابر
حسرت ہے گر دید کی اس کی　　پہلے دیکھو مر کر صابر

کون ہے اپنا کون پرایا سب سے رہو مل جل کر صابر
پہلے بھی جو لوگ تھے تجھ سے سلگے اندر اندر صابر
دل پر شب خوں مار رہے ہیں اندیشوں کے لشکر صابر

وہ خود کو صابر بن ذوقی لکھتے ہیں لیکن شاید "بن" کے لفظ میں رعایت معنوی بھی ہے، کہتے ہیں:-

صابر بن ذوقی تو نے کس کا روپ چرایا تھا
صابر بن ذوقی کو کس نے دور افق سے چھپتا دیکھا؟

حافظ صابر کو غزل، گیت، نظم، قطعہ اور رباعی سے زیادہ شغف ہے اور ان کی غزل میں گیت کا رنگ غالب ہے۔ غزل کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں:-

پھولوں سے میں پوچھ رہا تھا پتھر سے ٹکرایا کب تھا
سب کے ساتھ تھا محفل محفل لیکن خود کو تنہا دیکھا
تیرگی کہہ رہی ہے محفل سے دل جلاؤ تو روشنی ہوگی
خود سے ملنے کے واسطے اکثر آنسوؤں کے دیے جلاتا ہوں
میں نے اشکوں میں ڈوب کر دیکھا دل دھڑکتا ہے آبشاروں کا

صابر کے کلام کی امتیازی شان یہی ہے اور انھوں نے غم دل اور غم دوراں سے متاثر ہو کر ہی لکھا ہے۔ تاہم انھیں اعتراف ہے کہ

ع مجھے خبر ہے کہ میں ناتمام لکھتا ہوں

لیکن یہ اعتراف ان کے کلام کے "تمام و کمال" کے لیے پیش خیمہ ہے۔ اللہ پاک ان کو سلامت با کرامت رکھے۔ آمین۔

طلبہ کے لیے لکھے گئے مختصر مضامین

- دو قومی نظریہ
- دستور
- شاہ ولی اللہ کی تحریک
- میثاقِ لکھنؤ
- سارک
- مسلم لیگ کا قیام
- اکبر کی مذہبی پالیسی اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اصلاحات
- سر سید احمد خان کی سیاسی اور تعلیمی خدمات

"فرمایا حضرت صاحب مدظلہ نے"

ہم ذرا اپنے معاملات کا محاسبہ کریں اور دیکھیں کہ کن کن معاملات میں ہر روز ہم لوگ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے خلاف عمل کرتے ہیں۔

دو قومی نظریہ

قائداعظم نے فرمایا تھا کہ "پاکستان اسی دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو، مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے۔ وطن نہیں اور نہ نسل۔۔۔"

مولانا محمد علی جوہر نے ۱۹۱۳ء اور ۱۹۲۴ء میں بھی اسی طرح فرمایا تھا۔ نومبر ۱۹۳۹ء میں عیدالفطر کے موقع پر بمبئی میں قائداعظم نے فرمایا تھا کہ "ہمارا پروگرام قرآن پاک میں موجود ہے۔ ہم مسلمانوں کو لازم ہے کہ قرآن پڑھیں اور قرآنی پروگرام دیکھ کر اس پر عمل کریں۔۔۔"

علامہ اقبال نے اپنے خطوط میں بھی علیحدہ اسلامی ریاست کے قیام پر زور دیا ہے جہاں اسلامی قانون نافذ ہو جس سے ہر شخص کو حق معاش بھی صحیح طور پر حاصل ہو سکے گا۔ اس سے پہلے علامہ اقبال نے الٰہ آباد کے خطبے میں ۱۹۳۰ء ہی میں علیحدہ وطن کے حصول پر زور دیا تھا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو۔ منٹوپارک لاہور میں قائداعظم نے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے لیے ایک آزاد ملک کے قیام کا مطالبہ کیا۔ یہی قرار داد پاکستان کہلاتی ہے کہ مذہبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی اور انتظامی معاملات سب اسی آزاد ملک میں اسلام کے مطابق طے کیے جائیں۔ قیام پاکستان (۱۹۴۷ء) سے پہلے ہندوؤں نے بڑی سازش کر رکھی تھی۔ ہندوؤں نے چالاکی اور مکاری سے سکھوں کو بھی ہندو کہلایا اور اچھوتوں کو بھی ہندو کہلایا، حالانکہ یہ دونوں قومیں ان سے بالکل الگ تھیں۔ کشمیر کو بھی مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود وہاں کے راجہ ہری سنگھ سے سازش کر کے دو ٹکڑے کردیا جس کا معاملہ اب تک چل رہا۔

دستور

پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان نے قیام پاکستان کے بعد ہی پاکستان کا دستور محض اسلامی بنانے کے لیے مشرقی اور مغربی پاکستان کے بڑے بڑے علماء کو کام شروع کرادیا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں یہ دستور تیار ہوا۔ مملکت کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا۔ سربراہ مسلمان ہوگا۔ قرآن و سنت کے خلاف تمام قوانین منسوخ ہوں گے اور صرف اسلامی قانون نافذ ہوں گے۔ قرآنی تعلیم لازمی ہوگی۔ اسلامی اخوت کو فروغ دیا جائے گا۔ زکوٰۃ' اوقاف اور مساجد کا انتظام کیا جائے گااسلامی ممالک سے قریبی تعلقات قائم کیے جائیں گے۔ ہر شہری کو تحریر و تقریر۔انجمن سازی۔ مذہبی عبادات کی آزادی ہوگی۔ نواہی پر قدغن لگائی جائے گی وغیرہ۔ لیاقت علی خاں ۱۹۵۶ء میں یہ دستور نافذ کرنا چاہتے تھے لیکن مخالفین کی سازش سے انھوں نے استعفاء دیدیا اور یہ دستور نافذ نہ ہوسکا۔ پھر۱۹۶۲ء اور۱۹۷۳ء میں تبدیلی اور ترامیم کے بعد یہ دستور نافذ نہ ہوسکا۔ ۱۹۷۳ء میں قادیانی جماعت کو کافر قرار دیا گیا۔ اب بھی Islamic Idealogy council قائم ہے اور دشمنوں کی سازش کا شکار ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کی تحریک

مرہٹہ قوم کی نہ تو کوئی حکومت تھی اور نہ کوئی منظم قوم تھی۔ وہ خانہ بدوش ڈاکو تھے۔ اِدھر اُدھر پھرتے تھے اور موقع پاکر چوری چھپے لوٹ مار کرتے تھے۔ اورنگ زیب ان لوگوں کو سخت سزائیں دیتے تھے لیکن ان کے بعد ان کے جانشینوں میں کوئی طاقت نہ تھی تو مرہٹہ لوگ مسلمان آبادیوں کو آگ لگادیتے اور عورتوں اور بچوں پر ظلم و ستم کرتے تھے یہاں تک کہ ان کو جلادیتے تھے۔ ہندوؤں نے ایسے ظالم اور بدکردار لوگوں کی حرکتوں کوHindu National Movement کہا ہے۔ سکھ لوگ بھی مسلمان

حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بہت ظلم و ستم کرنے لگے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اس زمانے میں مسلمانوں میں حوصلہ پیدا کرایا۔ ان کی معاشرت کی اصلاح فرمائی۔ ان کی غفلت کو دور کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کے اطوار اور سنت پر عمل کرنے پر زور دیا اور عربی زبان سیکھنے کی ترغیب دی اور فرمایا کہ "عجمی رسوم اور ہندوؤں کی عادات کو اپنے درمیان باقی نہ چھوڑیں۔" شاہ ولی اللہؒ نے نجیب الدّولہ (شاہ عالم کے وزیر) کی ہمت افزائی کی اور احمد شاہ ابدالی کو افغانستان سے آنے کی دعوت دی۔ وہ آئے اور انھوں نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو ایسی شکست فاش دی کہ ان کے یہاں کوئی ایسا گھر نہ تھا جس میں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو۔ احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کی حکومت کو تسلیم کیا۔ اور واپس چلے گئے۔ حالانکہ شاہ عالم میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ ملک کو سنبھال سکیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تحریروں سے مسلمانوں کی دینی، ثقافتی، اور سیاسی شعور کو بیدار کیا اور اپنے بعد شاہ اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد بریلویؒ جیسے بزرگوں کو چھوڑا جنھوں نے قوم میں بیداری پیدا کی اور آخر میں پاکستان کی تحریک شروع ہوئی۔

میثاق لکھنؤ

(۱) تقسیم بنگال جس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچ سکتا تھا اس کے خلاف ہندوؤں نے بڑی سازش کی۔ (۲) تِلک نے مسجدوں کے سامنے باجے بجانے پر زور دیا۔ (۳) مسلمانوں کو ہندو بنانے کی شدھی سنگھٹن کی تحریک شروع ہوئی۔ (۴) مسجد کانپور کے شہید کرنے میں ہندوؤں نے انگریزوں کی حمایت کی۔ ایسی تمام تحریکیں ثابت کرتی تھیں کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے کتنی نفرت ہے۔ پھر بھی مسلمانوں کے لیڈروں نے (بالخصوص قائداعظم نے) ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشش کی۔ اور ۱۹۱۶ء میں اس اتحاد کے لیے مسلم لیگ

اور کانگریس کا اجلاس ہوا۔ اسے میثاق لکھنؤ کہتے ہیں۔ اس میں طے ہوا کہ جداگانہ انتخاب کے ذریعے صوبائی کونسلوں میں پنجاب میں مسلمانوں کی نشستیں نصف ہوں گی۔ بنگال میں ۴۰ فی صد ہوں گی۔ یوپی میں ۳۰ فی صد۔ بہار میں ۲۵ فی صد۔ بمبئی میں ۲۲ فی صد۔ مدراس اور سی پی میں ۱۵-۱۵ فی صد ہوگی اور مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نشستیں نصف ہوں گی۔ اس طرح ثابت ہوگیا کہ مسلمان ایک جدا گانہ قوم ہے اور کانگرس سے مختلف ہے۔

SAARC سارک (South Asian Association for Regional Co-operation)

یہ جنوبی ایشیا میں تعاون کی تنظیم ہے جس میں سات ملک شامل ہیں۔ یعنی پاکستان۔ بھارت۔ بنگلہ دیش۔ سری لنکا۔ نیپال۔ بھوٹان اور مالدیپ۔

قائداعظم نے ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو فرمایا تھا کہ "میں بار بار کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ (ملک کی) تقسیم باضابطہ معاہدے کی رو سے ہوئی ہے۔ اس لیے ہمیں ماضی تلخیوں کو بھلا کر آپس میں عہد کرنا چاہیے کہ ہم دوستوں کی طرح مل جل کر رہیں گے۔۔۔" لیکن بھارت نے پاکستان کی ہر پیشکش کو عملاً" رد کیا۔ تاہم جنوبی ایشیا کی سارک تنظیم کو بظاہر تسلیم کرلیا ہے اور اب تک ۵ کانفرنس مختلف ملکوں میں ہوچکی ہیں اور ہر ملک کے مفاد کے لیے تجویزیں منظور ہوئی ہیں۔ خدا کرے کہ دل میں بھی اتحاد اور اتفاق رہے۔

مسلم لیگ کا قیام
کانگریس سے مقابلہ
قائداعظم کے چودہ نکات

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جسے غدر بھی کہا جاتا ہے مسلمانوں کی تباہی کی تاریخ ہے۔ مسلمان حکمرانوں کا خاتمہ ہوا تو انگریزوں نے اس جنگ کا پورا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرایا۔ ہندوؤں نے منظم طور پر انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس قائم ہوئی تو اس نے خود کو مسلمانوں کا نمائندہ بھی ظاہر کرنا چاہا۔ لیکن عملی طور پر وہ صرف ہندوؤں کی نمائندہ جماعت تھی۔ سرسید نے ۱۸۸۶ءمیں کانگریس کے اس نظریے کی مخالفت کی۔ ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں نے اپنی الگ جماعت "مسلم لیگ" کے نام سے قائم کی۔ ۱۹۱۱ء میں جب پہلی جنگ عظیم (World War) شروع ہوئی تو انگریزوں نے ترکوں کی مخالفت کی۔ ہندوستان کے مسلمان اس کے مخالف ہوئے اور انھوں نے تحریک خلافت کی بنیاد ڈالی۔ اس تحریک میں منافقت کے طور پر گاندھی بھی شریک ہوگئے۔ اور ساتھ ہی ہندو تحریکیں شدھی۔ سنگٹھن بھی ان کے تعاون سے عروج پر پہنچ گئیں۔ ۱۹۲۸ء میں حکومت نے اعلان کیاکہ ہندو اور مسلمان دونوں ہم پر تنقید کرتے ہیں تو خود کوئی دستور بناکر دکھائیں۔ پنڈت موتی لال نہرو نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشش کی اور اپنی ایک رپورٹ تیار کی (جو ۱۹۱۶ء کے میثاق لکھنؤ سے مختلف تھی) جس میں حسب ذیل سفارشات تھیں:۔

(۱) ہندوستان کو Dominion Status کا درجہ دیا جائے۔(۲) سندھ کو بمبئی سے الگ صوبہ بنایا جائے بشرطیکہ وہ خود کفیل ہو۔(۳) مرکز میں ۳ر۱ نشستیں جو مسلمانوں کے لیے مخصوص ہیں، ختم کردی جائیں۔

مولانا شوکت علی اور مولانا حسرت موہانی نے اس رپورٹ پر سخت تنقید کی۔ پھر محمد علی جناح اور مولانا محمد علی جوہر (جو انگلستان گئے ہوئے تھے) واپس آئے تو انھوں نے بھی سخت تنقید کی اور یہ ترمیمات پیش کیں۔

(۱) Dominion Status کی تجویز پیش کرنے والے بہت بزدل ہیں۔ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختار بنایا جائے۔ (۲) مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی کم از کم ایک تہائی نمایندگی ہو۔ (۳) پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو ان کے تناسب سے نمایندگی دی جائے۔ ان مطالبات کو محمد علی جناح نے چودہ نکات میں واضح کیا۔

(۱) آئین بالکل وفاقی طرز کا ہو۔ بقیہ اختیارات صوبوں کے پاس رہیں۔ (۲) صوبوں کو خودمختاری حاصل ہو۔ (۳) اقلیتوں کو مناسب نمایندگی دی جائے اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں ان کی نمایندگی کم نہ کی جائے۔ اور برابر بھی نہ کی جائے۔ (۴) مرکزی مجلس قانون میں مسلمان ایک تہائی ہوں۔ (۵) جداگانہ انتخاب ہوں لیکن سب کو یہ اختیار بھی ہو کہ مخلوط انتخاب کر سکے۔ (۶) صوبوں کے علاقوں کو گھٹانا بڑھانا ہو تو پنجاب اور صوبہ سرحد کو بالکل نہ چھیڑا جائے۔ (۷) مکمل مذہبی آزادی ہو۔ (۸) کوئی قانون اس وقت تک منظور نہ ہو جب تک کسی قوم کے اراکین کا چوتھائی حصہ مخالفت کرتا ہو۔ (۹) سندھ کو الگ صوبہ بنایا جائے۔ (۱۰) صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بھی دوسرے صوبوں کی طرح اصلاحات نافذ کی جائیں۔ (۱۱) ملازمتوں میں مسلمانوں کا صحیح حصہ مقرر کیا جائے۔ (۱۲) آئین میں مسلمانوں کی ثقافت، تعلیم، زبان، اور اوقاف وغیرہ کا تحفظ ہو۔ (۱۳) مرکزی اور صوبائی وزراء میں ایک تہائی مسلمان ضرور ہوں۔ (۱۴) وفاق کی قانون ساز جماعت کے اتفاق کے بغیر اس کی مجلس میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔

اس کے بعد ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے خطبہ صدارت میں علامہ اقبال نے مسلمانوں کے لیے الگ وطن (پاکستان) کا مطالبہ کیا۔ پھر حکومت برطانیہ نے لندن میں تین مرتبہ

گول میز کانفرنس کی۔ گاندھی نے ارون سے معاہدہ کیا۔ کمیونل ایوارڈ بھی دیا گیا لیکن حاصل کچھ نہ ہوا۔ پھر ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کی نئی تنظیم ہوئی۔ پنجاب، بنگال، اور آسام کے تین وزیر اعلیٰ نے مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان کردیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں قائداعظمؒ نے علیحدہ وطن (یعنی پاکستان) کا مطالبہ کردیا۔ اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو (شب قدر بھی تھی) قیام پاکستان کا اعلان ہوگیا۔

"فرمایا حضرت صاحب مدظلہ نے"

مومن محبت کا مجسمہ اور الفت کا سرچشمہ ہے۔

وہ دعائیں جو بارگاہِ الٰہی میں خلوصِ دل اور خشوع وخضوع سے پیش کی جاتی ہیں وہ حقیقت میں دعائیں ہوتی ہیں اور ضرور انہیں شرفِ قبولیت حاصل ہوتا ہے۔

اکبر کی مذہبی پالیسی اور
حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ علیہ کی اصلاحات

اکبر۹۶۳ھ سے ۱۰۱۴ھ تک بادشاہ رہا۔ ہندو رانیوں سے شادی کرنے کی وجہ سے ۹۷۱ھ میں اس نے جزیہ لینا ختم کر دیا۔ عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ میں ۱۰۰۴ھ تک کے واقعات بڑی دلیری سے لکھے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ شروع میں اکبر کو دین اور دین والوں سے محبت تھی۔ اجمیر شریف پا پیادہ حاضر ہوتا تھا۔ طالب حق تھا لیکن غلط قسم کے علماء نے اس کے عقائد میں تبدیلی پیدا کر دی اور ۹۸۷ھ میں فیضی، ابوالفضل اور ان کے باپ نے اکبر کو درجہ اجتہاد پر فائز کر کے اسے خلیفہ الزماں بنا دیا۔ اب نماز، روزہ اور شعائر اسلام کو عقل کے خلاف کہا جانے لگا۔ محل میں آتش خانہ تیار ہوا۔ عیسائیوں کی طرح ناقوس اور تین خداؤں کی حمایت کی گئی۔ ہندوؤں کے برہما، مہادیو اور کشن وغیرہ کی تعظیم کی گئی۔ سورج کی عبادت دن میں چار مرتبہ کی جاتی۔ گائے اور اس کے گوبر کی پوجا خود اکبر کرنے لگا۔ گائے کا گوشت حرام کہا گیا۔ لیکن خنزیر اور شیر کا گوشت مباح قرار دیا گیا۔ ایک سرکاری شراب خانہ کھولا گیا۔ بڑے اہتمام سے ڈاڑھیاں صاف کی گئیں۔ فرض غسل کو فضول کہا گیا۔ جوان عورتوں کو منہ کھول کر چلنے کا حکم دیا گیا۔ مردے کو پانی میں ڈالنے یا درخت سے باندھنے کا حکم دیا گیا۔ قبلہ کی طرف خود اکبر پاؤں کر کے سوتا تھا۔ خود کو سجدہ کراتا تھا۔ عربی پڑھنا عیب کہا گیا۔ وحی کو محال، معراج اور معجزوں کو غلط کہا گیا۔ محمد، احمد، مصطفٰے جیسے ناموں کو تبدیل کیا گیا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کی گئیں۔ ابوالفضل کے ایک بھائی نے اسلامی عبادات کے خلاف رسالے لکھے تو انعام دیا گیا۔ بعض شاعروں کی طرح

فیضی بھی کتوں کی زبان اپنے منہ میں لیتا اور ان کے ساتھ کھانا کھاتا۔ چنانچہ مرتے وقت وہ کتوں کی طرح بھونکتا تھا۔ یہ سب تفصیل عبدالقادر بدایونی کی تاریخ میں موجود ہے۔ ۹۷۱ھ میں اکبر نے جزیہ ختم کیا تھا تو اسی سال اللہ تعالیٰ نے حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کو دین کی خدمت کے لیے پیدا کیا۔ حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ قریب ۱۸ سال کی عمر میں خود آگرہ تشریف لے گئے۔ فیضی اور ابوالفضل وغیرہ سے دینی مسائل پر بحث کی۔ ان کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے کچھ عرصے کے بعد واپس وطن کو ہوئے لیکن وہ عوام اور خواص سے مراسم پیدا کرکے اپنے مکتوبات سے ان کی اصلاح کی کوشش کرتے رہے۔ خان خاناں، صدر جہاں، خان اعظم، مرتضیٰ خان جیسے بڑے بڑے امراء کو انھوں نے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ پھر خود جہانگیر سے دین کے مسائل پر گفتگو کرنے کے لیے آگرہ تشریف لے گئے تو وہاں خوشامدی لوگوں نے جہانگیر کے کان بھردیے اور اس نے ان کو گوالیار کے قلعے میں قید کرادیا۔ لیکن قریب دو سال کے بعد آپ رہا ہوئے تو جہانگیر کی اصلاح فرمائی اور وہ آپ کا معتقد ہوگیا اور شعائرِاسلامی پھر رائج ہوئے، جو مسجدیں گرادی گئی تھیں وہ پھر تعمیر ہوئیں۔ گائے کا ذبیحہ پھر شروع ہوا۔ بادشاہ کو سجدہ تعظیمی موقوف ہوا۔ شاہجہاں آپ کا مرید ہوا۔ جہانگیر کے زمانے میں فن مصوری کو قرآن پاک کی خطاطی کی طرف منتقل کیا گیا۔ بعد میں اورنگ زیب حضرت مجددؒ کے صاحبزادے خواجہ محمد معصومؒ سے بیعت ہوا۔ دینی ماحول قائم ہوا اور فتاویٰ عالمگیری جیسی فقہ کی سب سے بڑی کتاب تیار کی گئی۔ اور یہ سلسلہ ایسا قائم ہوا کہ ملک کے تمام دینی مدارس حضرت مجددؒ ہی کے شاگردوں اور معتقدین نے قائم کیے اور اب بھی قائم کیے جارہے ہیں۔

سرسید احمد خان کی سیاسی اور تعلیمی خدمات

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جسے غدر بھی کہا جاتا ہے مسلمانوں کی تباہی کی تاریخ ہے۔ مسلمان ہی زیادہ برباد ہوئے اور انگریزوں نے ان کو ختم کرنے کا ہر ذریعہ استعمال کیا' وجہ صرف یہ تھی کہ اس سے پہلے برصغیر پاک و ہند میں مسلمان ہی حکمراں رہے تھے۔ دیوبند میں دینی تعلیم پر زور دیا گیا۔ لیکن سرسید نے دین اور دنیا دونوں کو ساتھ رکھنے کی کوشش کی۔ ۱۸۶۹ء (حیات جاوید میں ۱۸۷۰ء لکھا ہے) میں وہ خود انگلستان گئے۔ اور وہاں کی تعلیم' تربیت اور شائستگی پر غور کرکے واپس آئے اور ایک کمیٹی "خواستگار تعلیم مسلمان" بنائی۔ غور و خوض کے بعد کمیٹی نے طے لیا کہ ایک کالج ایسا قائم کیا جائے جہاں تہذیب' شائستگی' دین سے محبت اور انگریزی تعلیم ساتھ ساتھ ہو تاکہ غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمان بھی سرکاری ملازمتیں حاصل کرسکیں۔ چنانچہ علی گڑھ میں پہلے ایک گھاس پھوس کے بنگلے میں یہ کالج ۱۸۷۵ء میں قائم ہوا۔ بڑے اور چھوٹے سبھی طبقوں کے طلبہ اس کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۸۷۸ء میں اس کالج کا الحاق کلکتہ یونی ورسٹی سے ہوا۔ پھر الٰہ آباد یونی ورسٹی سے ہوا۔ ۱۸۸۱ء میں پہلے بار یہاں کے طلبہ بی اے کے امتحان میں شریک ہوئے۔ بعد میں ایم اے' اور قانون کے لیے درجے بھی شروع ہوئے۔ دینیات کی تعلیم شروع سے بی اے تک کے لیے لازمی قرار دی گئی۔ ۱۸۹۸ء میں سرسید کا انتقال ہوا۔ لیکن ان کی کوششیں بارآور رہیں اور ۱۹۲۰ء مین یونی ورسٹی قائم ہوگئی۔

سرسید کو سیاسی اور علمی خدمات کا جذبہ ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ۱۸۸۵ء میں کانگرس قائم ہوئی اور ملکی حقوق میں جو مراعات ہندوستانیوں کو حاصل ہوئی تھیں وہ ہندوؤں نے صرف اپنے لیے مخصوص کرنے کی کوشش کی تھی۔ سرسید نے ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو اینگلو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (علی گڑھ) میں اس بات پر زور دیا کہ سب سے پہلے مسلمانوں میں ادب کے ذریعے سیاسی بیداری پیدا کرنے کی ضرورت

ہے۔ اس کے لیے انھوں نے گذشتہ ادوار کے مسلمانوں کے علمی کارناموں اور ان کے سوانح پر کتابیں لکھنے کا مشورہ دیا۔ خود بھی مضامین لکھے اور اپنے رفقاء سے کتابیں لکھوائیں۔ ان کا رسالہ تہذیب الاخلاق بھی اسی مقصد کے لیے تھا اور قریب ۴۰ سال تک (یعنی ۱۸۵۰ء سے) ان کا مقصد مسلمانوں میں علمی بیداری پیدا کرنا تھا۔ اسی علمی بیداری نے قوم میں ایسے لوگ پیدا کیے جنھوں نے پاکستان بنایا۔ وہ علی گڑھ ہی کے طلبہ تھے جنھوں نے ملک کے گوشے گوشے میں جاکر (قائداعظم کے حکم پر) مسلمانوں کو مسلم لیگ کا ہم خیال بنا کر ان کو پاکستان بنانے کے لیے تیار کیا تھا۔

"فرمایا حضرت صاحب مدظلہ نے"

ہم ذرا اپنے معاملات کا محاسبہ کریں اور دیکھیں کہ کن کن معاملات میں ہر روز ہم لوگ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے خلاف عمل کرتے ہیں۔

نماز میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا طویل قیام، طویل رکوع اور طویل سجدہ بہت سی ورزشوں کا نعم البدل ہے۔ دل کے امراض کے جدید ترین ماہرین بھی یہی مشورہ دیتے ہیں۔

حضرت مولانا قاری پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان مدظلہ العالی کی دیگر کتابیں

۱۔ مطالب القرآن (قرآن پاک کی مختصر و جامع تفسیر)
۲۔ ہمہ قرآن در شان محمدؐ (ترجمہ قران پاک) انعام یافتہ
۳۔ اقبال اور قرآن (صدارتی انعام یافتہ)
۴۔ اردو میں قرآن اور احادیث کے محاورے (انعام یافتہ)
۵۔ تفسیر مولانا عبید اللہ سندھیؒ آخری پارہ (تصحیح و تہذیب)
۶۔ ترجمہ قرآن مجید از مخدوم نوحؒ پہلا پارہ (تصحیح و تہذیب)
۷۔ تفسیر شیخ الہند محمود حسنؒ پہلے دو پارے (انگریزی ترجمہ)
۸۔ ضیاء القراءات (تجوید و قرءت) حضرت ضیاء الدینؒ
۹۔ قرآنی عربی
۱۰۔ ندائے سحر (قرآنی مضامین) ریڈیو تقاریر
۱۱۔ قرآن و حدیث کے صنائع و بدائع (انعام یافتہ)
۱۲۔ علامہ سیوطیؒ اور علم لغت
۱۳۔ آسان احکام حج (اردو، سندھی اور انگریزی)
۱۴۔ آسان احکام حج (تجربہ کی روشنی میں)
۱۵۔ سعید البیان از شاہ احمد سعید دہلویؒ (سیرت پاک) تصحیح و تہذیب
۱۶۔ سراج منیر (سیرت پاک)
۱۷۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی خصوصیات
۱۸۔ عبدالعزیز خالد کی نعت گوئی
۱۹۔ اثبات النبوۃ از حضرت مجدد الف ثانیؒ (تصحیح و تہذیب)
۲۰۔ رسالہ تہلیلیہ از حضرت مجدد الف ثانیؒ (تصحیح و تہذیب)
۲۱۔ رد روافض از حضرت مجدد الف ثانیؒ (تصحیح و تہذیب)
۲۲۔ فضائل صحابہؓ از حضرت مجدد الف ثانیؒ (تصحیح و تہذیب)
۲۳۔ مکاشفات عینیہ از حضرت مجدد الف ثانیؒ (تصحیح و تہذیب)
۲۴۔ مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانیؒ
(فارسی، تین جلدیں، پاکستان، ترکی، تصحیح و تہذیب)
۲۵۔ انتخاب مکتوبات (تصحیح و تہذیب)
۲۶۔ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ (ایک تحقیقی جائزہ)
۲۷۔ مکتوبات خواجہ محمد معصومؒ (تین جلدیں، پاکستان۔ ترکی)
۲۸۔ مکتوبات خواجہ سیف الدینؒ
۲۹۔ مکتوبات خواجہ محمد نقشبند ثانیؒ (دو جلدیں)
۳۰۔ مکتوبات خواجہ عبدالاحد وحدت سرہندیؒ
۳۱۔ مکتوبات خواجہ عبید اللہ سرہندیؒ
۳۲۔ مکتوبات ریاست دیر، لوائح خانقاہ مظہریہ
۳۳۔ مکتوبات شاہ احمد سعید دہلویؒ
۳۴۔ رسائل مشاہیر نقشبندیہ
۳۵۔ ملفوظات اکابر نقشبندیہ
۳۶۔ ارشاد رحیمیہ از شاہ عبدالرحیمؒ (تصحیح و تہذیب)
۳۷۔ ہدایت الطالبین از شاہ ابو سعیدؒ (فارسی سے اردو ترجمہ)
۳۸۔ سوانح امیر کلالؒ
۳۹۔ مسائل اربعین از شاہ احمد سعید دہلویؒ (تصحیح و تہذیب)
۴۰۔ دیوان مرزا مظہر جان جاناںؒ (مع خریطہ جواہر)
۴۱۔ وصال احمدیؒ از حضرت بدرالدین سرہندیؒ (تصحیح و تہذیب)
۴۲۔ مجمع البحرین از مولانا پائندہ محمدؒ (تصحیح و تہذیب)
۴۳۔ سبیل الرشاد از خواجہ عبدالاحد وحدتؒ (تصحیح و تہذیب)
۴۴۔ حضرات القدس (فارسی سے اردو) انعام یافتہ
۴۵۔ زبدۃ المقامات (فارسی سے اردو ترجمہ)

۴۶۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر
(علامہ ابن تیمیہؒ) عربی سے اردو
۴۷۔ مسائل ا۔بلہ از شیخ احمد دہلویؒ
(مدیر دار الحدیث مدینہ منورہ) عربی سے اردو
۴۸۔ حکم اللحوم المستوردہ وذبائح اہل الکتاب وغیرہم
از شیخ عبداللہ بن محمد بن حمید، رئیس مجلس القضاء
الاعلی والرئیس العام مکہ مکرمہ (عربی سے اردو)
۴۹۔ تنبیہات علی ان محمد لیست میقاتا از شیخ عبداللہ
بن محمد بن حمید (عربی سے اردو) مکہ مکرمہ
۵۰۔ ملفوظات صوفیہ
۵۱۔ تحفہ زواریہؒ
۵۲۔ وسیلۃ القبول (دو حصے)
۵۳۔ گلشن وحدت (تصحیح و تہذیب)
۵۴۔ رسالۂ سلوک
۵۵۔ خزینۃ المعارف (حضرت عبیداللہ سرہندیؒ)
۵۶۔ باقیات باقیؒ
۵۷۔ طوبیٰ لہم
۵۸۔ عارف نامہ (فارسی)
۵۹۔ سفرنامے
۶۰۔ مسلمانوں کا علم و ادب برصغیر میں
۶۱۔ برصغیر میں حق و باطل کے معرکے
زبان و ادب پر اسلام کے احسانات
۶۲۔ اردو کا دینی ادب تاریخ ادبیات
(پنجاب یونی ورسٹی) جلد اول
۶۳۔ سید حسن غزنویؒ
۶۴۔ تحریر و تقریر
۶۵۔ دیوان روشن سرہندیؒ
۶۶۔ معارف اقبال (فکر اسلامی)
۶۷۔ متین برہان پوری کے مرثیے
۶۸۔ تاریخ اسلاف
۶۹۔ سراج البیان
۷۰۔ ہمارا علم و ادب
۷۱۔ تاریخ بہرام شاہ غزنوی (انگریزی میں)
۷۲۔ فارسی پر اردو کا اثر
۷۳۔ حالی کا ذہنی ارتقاء
۷۴۔ علمی نقوش
۷۵۔ فارسی کے چند قدیم شعراء
۷۶۔ ادبی جائزے
۷۷۔ دیوان عظیم تتوی (سندھی ادبی بورڈ)
۷۸۔ تحقیقی جائزے
۷۹۔ سندھی اردو لغت (ڈاکٹر بلوچ صاحب کے تعاون سے)
۸۰۔ اردو سندھی لغت (ڈاکٹر بلوچ صاحب کے تعاون سے)
۸۱۔ ثقافتی اردو
۸۲۔ مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت کابل
۸۳۔ چند فارسی شعراء
۸۴۔ ہفت محفل
۸۵۔ بھولی ہوئی کہانیاں
۸۶۔ منتخبات
۸۷۔ تاریخ ادبیات فارسی برصغیر میں (انگریزی میں)
۸۸۔ اسٹڈیز ان لٹریچر (انگریزی میں)

۸۹۔ نصائح مصطفوی (تقاریر، اعزازی تقاریب)

۹۰۔ آسان طبی نسخے

۹۱۔ مکتوبات زواریہ

۹۲۔ مکتوبات ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

۹۳۔ اوراق گم گشتہ

زیر نگرانی ترجمے (فارسی سے اردو)

از مولوی قدیر محمد قریشی اکبر آبادی سابق جج

۱۔ انفاس رحیمیہ (حضرت شاہ عبدالرحیمؒ م ۱۱۳۱ھ)

۲۔ رسالہ محبوب العارفین

(حضرت خواجہ عزیزان علی رامیتنیؒ م ۷۱۵ھ)

۳۔ معمولات مظہریہ

(حضرت خواجہ مرزا مظہر جان جاناں م ۱۱۹۵ھ)

۴۔ عارف نامہ (حضرت خواجہ عارف ریوگریؒ م ۶۱۶ھ)

باسمہٖ تعالیٰ۔ حامدا ومصلیا

غلام مصطفٰی اکادمی (پاکستان) کی مطبوعات

اللہ پاک کا کس زبان سے شکرادا کیا جائے کہ غلام مصطفٰی اکادمی (پاکستان) نے اشرف المشائخ، قدوۃ المحققین، وحید العصر حضرت مولانا پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفٰی خان صاحب مدظلہ العالی کے تحریر کردہ غیر مدون اور غیر مطبوعہ مضامین وتقاریر ۱۹۳۶ء سے ۲۰۰۳ء تک، مختلف ذرائع سے تلاش کر کے جمع کئے ہیں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء کے مضامین کی تلاش جاری ہے۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کامیابی عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

ان میں سے چند مضامین اکادمی ھٰذا کتابی صورت میں شائع کر چکی ہے جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ اوراقِ گم گشتہ (غیر مدون وغیر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ)

۲۔ نور القمر (قدیم ترین مضامین کا مجموعہ)

۳۔ آسان احکام حج تجربے کے آئینہ میں۔

۴۔ سندھ کے نقشبندی اولیاء (مع نایاب رنگین تصاویر)

۵۔ سندھ باب الاسلام

۶۔ ایٹمی دھماکہ اور ہماری ذمہ داریاں (پاکستان کے موجودہ حالات کا حل)

۷۔ حضرت غریب نوازؒ اور سلسلہ عالیہ چشتیہ

۸۔ ایک سفر کئی راوی (مع نایاب تصاویر، حیدرآباد تا سرحد چین، مزارات کے حالات)

۹۔ مناقب حضرت صاحب مدظلہٗ

۱۰۔ اصلاحی خطبات (دفتر اول)

غلام مصطفٰی اکادمی (پاکستان)

حیدرآباد۔ کراچی

ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم○ سورۃ ال

یہ اللہ کا فضل ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

صاحب تصنیف

اسم گرامی : ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان ابن مجاہد ملت حضرت گلاب خان علیہ الرحمہ

ولادت : دوشنبہ (پیر) ۱۰ شوال المکرم ۱۳۳۰ھ ۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۱۲ء بوقت اذان فجر، بمقام جبل پور (بھارت)

خلیفہ مجاز : مقتدائے عرب و عجم شیخ کبیر حضرت مولانا عبدالغفور عباسی، مہاجر مدنی قدس سرہ

: عمدۃ السالکین فقیہ العصر حضرت مولانا شاہ زوار حسین نقشبندی مجددی قدس سرہ

تعلیم : فاضل علوم اسلامیہ، فاضل عربی، قراءت سبع

۱۹۳۲ء ۱۹۳۲ء ۱۹۴۱ء

ایم اے (فارسی)، ایم اے (اردو)، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

۱۹۳۴ء ۱۹۳۵ء ۱۹۳۶ء ۱۹۴۶ء ۱۹۵۶ء

اساتذہ کرام : حضرت قاری ضیاالدین الہ آبادی، مولانا سلیمان اشرف، علامہ سید سلیمان ندوی،
حضرت صدر یار جنگ شروانی، پروفیسر ضیا احمد بدایونی، مولانا احسن مارہروی،
ڈاکٹر ہادی حسن، بیرسٹر خسرو اسحاق

تلامذہ (شاگرد) : ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ایوب قادری،
ابن انشاء، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، جسٹس نعیم الدین، ڈاکٹر ملک غلام مرتضےٰ
ڈاکٹر نجم الاسلام، ڈاکٹر مسعود احمد، وغیرہ

تدریسی خدمات : صدر شعبہ اردو ۔ ناگ پور یونی ورسٹی (بھارت) ۱۹۳۶ء ۔ اردو کالج (کراچی) ۱۹۴۹ء
کراچی یونی ورسٹی (کراچی) ۱۹۵۵ء ۔ سندھ یونی ورسٹی (حیدر آباد) ۱۹۵۶ء
پروفیسر ایمریطیس (تاحیات پروفیسر) سندھ یونی ورسٹی جامشورو

اعزازات : ستارہ امتیاز (حکومت پاکستان) ۱۹۹۲ء، اقبال ایوارڈ (حکومت پاکستان) ۱۹۸۳ء
نشان سپاس (انجمن ترقی اردو) ۱۹۸۸ء، نقوش ایوارڈ ۱۹۸۳ء
طلائی تمغہ سندھ یونی ورسٹی (۵۰ سالہ علمی ادبی تحقیقی خدمات پر) ۱۹۹۰ء
نشان سپاس (ہمدرد فاؤنڈیشن) ۱۹۹۲ء، نشان سپاس (پاکستان نیشنل اکیڈیمی) ۱۹۹۵ء
نشان سپاس، پاکستان نیشنل اکیڈیمی (پاکستان میں سب سے زیادہ پی ایچ ڈی
کرانے والی شخصیت) ۱۹۹۸ء

تصانیف : سو سے زائد تصانیف تالیفات، سیکڑوں تحقیقی مضامین اس کے علاوہ ہیں۔
پانچ کتابیں انعام یافتہ ہیں۔ فہرست کتاب کے اندر درج ہے۔

مرتبہ ——— احقر ——— سرفراز